دورِ جدید

مخزن لاہور

مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی

قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم، باغ جناح لاہور

مخزن

شمارہ مسلسل ۱۰

۲۰۰۵ء

جلد ۵ شمارہ ۲

مجلس ادارت

عنایت اللہ (صدر مجلس)

انتظار حسین

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر انور سدید

امجد اسلام امجد

ڈاکٹر طاہر تونسوی

ڈاکٹر وحید قریشی (مدیر اعزازی)

شہناز مزمل (منتظم)

جملہ حقوق محفوظ

ناشر: قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح لاہور

فون نمبر: ۹۲۰۱۰۰۷_فیکس: ۹۲۰۱۰۰۶

ای میل: qal@brain.net.pk

ویب سائٹ: www.qal.edu.pk

کمپوزر: محمد اکرام الحق

طابع: ارفع پرنٹنگ سروسز، عزیز منشن، گلی نمبر 4، رائل پارک لاہور

صفحات: ۱۵۶

قیمت: ۱۰۰/- روپے

ضروری نوٹ

(۱) مخزن میں شائع ہونے والی نگارشات کے مندرجات سے قائداعظم لائبریری اور مجلس ادارت کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

(۲) تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو دو نسخے روانہ کیے جائیں۔

(۳) ادبی معاملات میں جملہ خط و کتابت مدیر مخزن، معرفت قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم، باغ جناح لاہور سے کی جائے۔

(۴) مالی امور میں چیف لائبریرین قائداعظم لائبریری سے رجوع کیا جائے۔

ترتیب

اداریہ ۵

شخصیت، سوانح، آپ بیتی

۱۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی سے وابستہ چند یادیں — ڈاکٹر زاہد منیر عامر — ۷

۲۔ شان الحق حقی کی ادبی شخصیت — ڈاکٹر انور سدید — ۱۶

تنقیدی مقالات

۱۔ بیانیات کی اصطلاحات — ناصر عباس نیر — ۲۳

۲۔ ادبی دبستان بہ حیثیت تہذیبی مراکز — ڈاکٹر عبدالمغنی — ۳۱

۳۔ مکتوبات مشفق خواجہ — محمد حمزہ فاروقی — ۳۵

۴۔ غالب کا ایک خط بنام سرسید احمد خاں — پرتو روھیلہ — ۶۳

۵۔ غم زمانہ بھی سہل گزرا — یونس حسن — ۶۵

تحقیق

۱۔ آگرہ میں اردو صحافت — ڈاکٹر سید اختیار جعفری — ۷۱

۲۔ مولانا حسرت موہانی کی تذکرہ نگاری — شفقت رضوی — ۸۱

۳۔ پاکستان میں تحقیق کی موجودہ صورت حال — ڈاکٹر سلیم اختر — ۱۰۰

کتابیات (انتخاب)

۱۔ مرزا ابن حنیف کی تصانیف — سمیرا احمرین — ۱۰۵

۲۔ عباد اللہ اختر کی تصانیف — ناز شوکت علی — ۱۰۶

فنون لطیفہ

۱۔ مصورانہ خطاطی۔ اعزازات کی زبانی — اسلم کمال — ۱۱۰

۲۔ اسلامی کلاسیکی خطاطی و عمل موجد — پروفیسر غلام رسول تنویر — ۱۱۷

طنز و مزاح

۱۔ غالب جدید شعرا کی محفل میں — کنہیالال کپور — ۱۳۰

قائداعظم لائبریری

کتب موصولہ برائے تبصرہ — شہناز مزمل — ۱۴۱

مخزن کے بارے میں آرا — ۱۴۴

قائداعظم لائبریری میں اس ششماہی کی کتب — فہیم عثمانی — ۱۴۷

قائداعظم لائبریری کی علمی و ادبی سرگرمیاں — شہناز مزمل — ۱۵۳

دسویں شمارے کے قلمی معاونین — ۱۵۶

اداریہ

مخزن میں پچھلے سال سے ہم نے ایک سیکشن کا اضافہ کیا تھا۔ فنون لطیفہ کا یہ حصہ بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ سب سے زیادہ خطوط اسی کے بارے میں وصول ہوئے ہیں۔ اس لیے ہمارا ارادہ ہے کہ اس موضوع کو مخزن میں مستقل جگہ دی جائے۔ ہم نے مصوری سے آغاز کیا تھا۔ پچھلے شمارے میں تین اہم مصوروں کے بارے میں مقالات شائع ہوئے لیکن عدم گنجائش کی وجہ سے تیسرے مقالے کا صرف دو تہائی حصہ شائع کیا جا سکا۔ اس بار ہم باقی ماندہ حصہ بھی شائع کر رہے ہیں تا کہ مصورانہ خطاطی کا موضوع مکمل ہو جائے اور قارئین کو عدم تکمیل کا احساس نہ ہو۔

مصورانہ خطاطی پچھلے چند برس سے پاکستان میں اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ تین مصور سرفہرست رہے۔ اسلم کمال، بشیر موجد اور صادقین۔ اسلم کمال کی خطاطی کی بنیاد خط کوفی ہے، موجد نے خط ثلث خصوصاً طغریٰ نویسی کو اختیار کیا، صادقین کے ہاں خط ریحان کو اساس بنایا گیا لیکن ہر سہ مصور ان خطوط کی سکہ بند پیائشوں کے اسیر نہیں ہوئے صرف بنیادی تاثر ہی کو لے کر آگے بڑھے ہیں اور کمال فن کا اظہار کیا ہے۔

فنون لطیفہ میں ان شاء اللہ آئندہ دیگر مصوروں کے اہم پہلوؤں کا بھی احاطہ ہوگا۔ اس کے علاوہ دوسرے فنون لطیفہ (مثلاً فوٹوگرافی، ایچنگ اور بت سازی وغیرہ) کو بھی شامل مجلّہ کیا جائے گا۔

مدیر

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی سے وابستہ چند یادیں

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

ڈاکٹر صاحب مرحوم سے میری ایک ہی ملاقات ہوئی لیکن ان کے ساتھ رابطہ طویل عرصے تک رہا، رابطے اور ملاقات کا سبب مولانا ظفر علی خان سے ان کی اور میری مشترکہ دلچسپی بنا۔ ڈاکٹر صاحب سے رابطے کی روداد دراصل میری اپنی زندگی کا ایک ورق ہے، اس لیے خودستائی کا اندیشہ ہے اور اسی اندیشے کے باعث اب تک یہ یادیں قلم بند نہیں کی جا سکی تھیں۔

میرا کالج کی طالب علمی کا ابتدائی زمانہ تھا جب مولانا ظفر علی خان کی شخصیت سے دل چسپی نے دل میں یہ خیال بٹھا دیا تھا کہ انہیں جاننے کے لیے ان کے خطوط پڑھنا چاہییں لیکن خطوط کہیں دستیاب نہیں تھے جن مصادر اور اصحاب سے خطوط ملنے کی توقع تھی وہاں ایک ہی جواب تھا کہ مولانا ظفر علی خان خط نہیں لکھتے تھے۔ پھر ان کے خطوط کی تلاش چہ معنی دارد.....؟ مولانا ظفر علی خان کے شاگرد شورش کاشمیری نے یہ لکھ کر گویا ان کے خطوط کی تلاش کا باب ہی بند کر دیا تھا کہ:

> ''خط و کتابت کا معاملہ یہ تھا کہ نہ خود کسی کو خط لکھتے اور نہ کہیں سے کوئی خط انہیں آتا تھا۔ یہ ایک دلچسپ قسم کا سانحہ ہے کہ کسی شخص کے پاس بھی ان کا کوئی خط نہیں ہے۔ جن دنوں جوش ملیح آبادی نے دہلی سے ''کلیم'' نکالنے کا قصد کیا تو پہلے شمارے کے لیے نظم طلب کی۔ اپنے خط میں جوش نے حیدر آباد سے نکالے جانے کا واقعہ بھی لکھا۔ مجھے یاد ہے وہ خط ایک لمبی سلپ پر تھا اور مولانا نے ہم بہت سے نوجوانوں کو پڑھ کر سنایا تھا۔ انہوں نے کوئی جواب لکھا ہو، اس میں شک ہے کیونکہ مولانا کی طبیعت خط و کتابت کی طرف نہیں آتی تھی''۔[1]

اس ''سانحے'' کے باوجود طبیعت یہ بات ماننے پر آمادہ نہ ہوتی تھی کہ مولانا ظفر علی خان نے کبھی خط نہ لکھا ہوگا، چنانچہ طبیعی تجسس تلاش مکاتیب ظفر علی خان کے سفر پر لے نکلا۔ سرگودھا، لاہور، راولپنڈی، ربوہ (اب چناب نگر) فیصل آباد، کراچی اور برٹش میوزیم لندن جہاں کہیں بھی کوئی امکان نظر آیا فوراً رابطہ کیا گیا، صرف موخر الذکر مقام ایسا تھا جہاں خطوط ہی کے ذریعے رابطہ رہا باقی تمام مقامات پر سفر کر کے خود پہنچا۔ السّعی مِنّا و الاتمام مِن اللّٰہِ۔ رفتہ رفتہ امید کی کرنیں پھوٹنے لگیں اور یوں ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل مکاتیب ظفر علی خان مرتب ہو گئی[2]۔ تلاش و تحقیق کے اسی سفر میں جب میں کراچی پہنچا تو وہاں کے کتب خانوں، اصحاب علم اور نیشنل میوزیم سے بھی رابطہ کیا، سرگودھا میں رہتے ہوئے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی صاحب نے مولانا ظفر علی خان پر پی ایچ۔ڈی کی سطح کا تحقیقی کام کیا ہے لیکن اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ محمد عبداللہ قریشی صاحب مرحوم کے درجات بلند فرمائے جن سے ملنے کے لیے میں لاہور آیا اور اپنے بعض استفسارات ان کے سامنے رکھے۔ مقصود مولانا ظفر علی خان کے خطوط ہی کا حصول تھا۔ مرحوم بہت شفقت کے ساتھ پیش آئے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی صاحب کا پتہ بھی فراہم کریں گے۔ میرے اس زمانے کے کاغذات میں عبداللہ قریشی صاحب کا ایک خط موجود ہے جسے تبرکاً محفوظ کیا جاتا ہے۔

۲/اگست ۱۹۸۳ء

عزیزم۔ السلام علیکم

آپ کا خط ملا میں حسب وعدہ دوسرے دن آپ کا انتظار کرتا رہا مگر موسم کی خرابی کی وجہ سے آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کا مجھے بھی افسوس ہے۔ اقبال کی گائے والی نظم مولانا ظفر علی خان نے علی بخش کے ذریعے اقبال ہی کو بھیجی تھی اس لیے اس کو اقبال ہی کے نام سمجھنا چاہیے[۳]۔ ظاہر ہے کہ علی بخش نے بھی وہ لے جا کر اپنے آقا کو ہی دے دی تھی، پتے یہ ہیں:۔

(۱) شیخ کرامت اللہ۔ شاہ فیصل گیٹ۔ گجرات

(۲) ڈاکٹر نظیر الحسنین زیدی۔ ''المہدی'' 25/XI/III/D ناظم آباد نمبر 3، کراچی 1807

لاہور اورینٹل کالج کے پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے بھی اپنا تحقیقی مقالہ مولانا ظفر علی خان پر ہی لکھا تھا، وہ کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ نہ دیکھا ہو، تو اب دیکھ لیجیے۔ شاید اس میں بھی کوئی کام کی بات مل جائے[۴]۔

مولانا ظفر علی خان کی ایک اور نظم ''مدینے کا کبوتر'' ہے۔ بعض لوگوں نے اسے اقبال کے نام جڑ دیا ہے۔ دراصل اقبال کو اچھی نسل کے کبوتر پالنے کا شوق تھا۔ کبوتروں کا ایک جوڑا کسی نے مدینے سے لا کر اقبال کو دیا تھا۔ ایک کبوتر کو بلی کھا گئی۔ مولانا ظفر علی خان نے اقبال کا غم غلط کرنے کے لیے اس کا مرثیہ لکھا تھا[۵]۔ اسے بھی آپ مولانا ظفر علی خان کی طرف سے اقبال کے نام خطوں میں شمار کر سکتے ہیں۔

مخلص

محمد عبداللہ قریشی

مرحوم بزرگ کا یہ خط سفر کراچی کے لیے راہ نما بنا لیکن غالباً اس سے پہلے ڈاکٹر نظیر حسنین صاحب کو خط لکھ کر اپنے منصوبے سے مطلع کیا اور تلاش خطوط کے سلسلے میں ان سے استمداد کیا گیا لیکن جواب نہ ملا۔ کئی ماہ گزر جانے کے بعد یاد دہانی کا خط بھیجا گیا جس کا جواب آیا اور معلوم ہوا کہ میرا پہلا خط ضائع نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا:

27/2/84

گرامی محترم و مکرم! سلام مسنون

از حد معذرت خواہ ہوں کہ جناب والا کے گرامی نامہ کے جواب میں تعویق در تعویق واقع ہوئی۔ یقیناً جناب کا گرامی نامہ ۴/اگست ۸۳ء پیش نظر ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں (۱) چونکہ میں چنیوٹ آتا رہتا ہوں، اس لیے یہ خیال رہا کہ میں خود سرگودھے جا کر نیاز حاصل کروں گا لیکن اپنے کاموں میں الجھ جانے کے باعث یہ موقع نہ مل سکا۔

(۲) جناب کا یہ خط کسی جگہ رکھا گیا، اس لیے کئی ماہ کے بعد ملا۔

میرے پاس مولانا کے ایک خط کا فوٹو سٹیٹ ہے۔ وہ آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ ابھی تک وہ میرے کاغذات میں سے مل نہیں سکا ہے۔

(۲) میرے پاس مولانا کی اس کاپی کا ایک صفحہ ہے جس کاپی پر انہوں نے نظموں کی فہرست تیار کی تھی۔ اس کا تو فوٹو سٹیٹ بھی عنقریب روانہ کر دوں گا۔ اپنی ایک کتاب ظفر علی خان بحیثیت شاعر[۶] الگ روانہ کر رہا ہوں۔

فقط والسلام احقر

نظیر حسنین زیدی

۲۷ فروری ۸۴ء کو لکھے گئے اس خط سے راقم سطور کے خط کی تاریخ (۴/اگست ۸۳ء) بھی معلوم ہو جاتی ہے گو خط کا جواب سات ماہ کی تاخیر سے ملا لیکن خط کے مندرجات بہت حوصلہ افزا تھے، ''سرگودھے آ کر'' ایک معمولی طالب علم کے ''نیاز حاصل کرنے'' کی بات سے مکتوب نگار کی شخصیت کا حسن واضح ہوا اور یہ اندازہ بھی ہوا کہ انہوں نے کسی تردد یا تکلف کے بغیر جو تعاون ممکن تھا اس کا وعدہ کر لیا، میرے خیال میں ایک اجنبی مکتوب نگار کو دیا جانے والا یہ جواب ڈاکٹر صاحب کی غیر معمولی خوش خلقی کو ظاہر کرتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان کا وہ خط جس کی نوید مسرت ڈاکٹر صاحب نے منقولہ گرامی نامے میں دی کس کے نام ہے اور وہ صفحہ جس کا فوٹو سٹیٹ ڈاکٹر صاحب کے پاس محفوظ ہے مجھے کب تک مل سکتا ہے یہ جاننے کے لیے اور خط کی رسید اور شکریے کے لیے فوری عریضہ لکھا گیا، جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا:

25/XI/III/D

ناظم آباد نمبر ۳۔ کراچی نمبر ۱۸

12/3/84

گرامی محترم! سلام مسنون

گرامی نامہ ملا، دو چیزیں آپ کے لیے بھیج رہا ہوں:

(۱) نمونہ خط مولانا ظفر علی خان مرحوم

(۲) نمونہ کاپی جو فہرست انہوں نے نظموں کے لیے بنائی تھی۔

کتاب علیحدہ پیکٹ میں ارسال خدمت ہے۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

فقط والسلام احقر

نظیر حسنین

اس مکتوب کے ساتھ مولانا ظفر علی خان کے کسی خط کی نقل منسلک نہیں تھی شاید ڈاکٹر صاحب بھول گئے تھے یا نمونہ خط سے مولانا کا عکس تحریر مراد ہو، البتہ دوسرے نمبر پر مذکور فہرست کے ایک صفحے کا عکس منسلک تھا جو بعد ازاں بہارستان کا ایک ورق کے نام سے نوادرات کے ضمن میں مکاتیب ظفر علی خان میں شامل ہوا۔ ے ڈاکٹر صاحب کے اس دوسرے خط جو ارمغانِ علمی الگ پیکٹ میں موصول ہوا وہ ان کی کتاب مولانا ظفر علی خان بحیثیت شاعر تھی جو ''ہدیہ اخلاص گرامی محترم جناب زاہد منیر عامر صاحب احقر نظیر حسنین زیدی ۱۰ مارچ ۸۴ء'' کے الفاظ کے ساتھ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ ۱۲/مارچ کے لکھے ہوئے خط کو سرگودھا پہنچنے میں تین چار روز تو ضرور لگے ہوں گے۔ جس روز خط اور کتاب موصول ہوئے اسی روز کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا گیا۔ اس زمانے میں یہ طریقہ رہا کہ جس تاریخ کو کتاب کا مطالعہ مکمل ہوتا وہ تاریخ آخری صفحے پر درج کر دیا کرتا تھا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو اس کتاب کے آخری صفحے پر اپنے دستخطوں کے ساتھ ۱۸/مارچ ۱۹۸۴ء کی تاریخ درج ہے۔ گویا تین ہی چار روز میں کتاب پڑھ

لی گئی، کتاب پر جا بجا نشانات موجود ہیں اور ایک کاغذ بھی جس پر اس تصنیف سے متعلق سوالات درج ہیں، کتاب پڑھ کر یہ سوالات ڈاکٹر صاحب کو بھجوائے گئے تھے۔ سوالات کیا تھے میری خام کاری کا ایک نمونہ تھا۔ چونکہ وہ کاغذ اب بھی اسی کتاب میں رکھا ہوا ہے اس لیے سوالات نقل کرتا ہوں:

۱۔ صفحہ نمبر ۳۷ پر حاشیے میں مولانا ظفر علی خان کی قومی شاعری کا حوالہ دیا گیا ہے، کیا یہ کسی کتاب کا نام ہے یا مضمون کا اور اس کا مصنف کون ہے.....؟

۲۔ آپ نے صفحہ ۳۹ پر شبلی نعمانی کو ظفر علی خان کا استاد لکھا ہے کیا انہیں مولانا ظفر علی خان کا استاد کہا جا سکتا ہے.....؟

۳۔ آپ نے مولانا کی تصانیف شعری میں خیالستان ۸ کو بھی شامل کیا ہے جو غالباً مولانا کا خود مرتب کردہ مجموعہ نہیں اور اس میں شامل بیشتر کلام ان کے دوسرے مجموعوں میں موجود ہے، اگر محض مجموعوں کا تعارف مقصود تھا تو خمستانِ حجاز ۹ کا بھی اندراج ہونا چاہیے تھا۔ یہ مولانا ظفر علی خان کی نعتوں کا مجموعہ ہے جو ان کا خود مرتب کردہ نہیں۔

۴۔ بہارستان کے ضمن میں صفحہ ۵۳ پر مولانا ظفر علی خان کی ایک تحریر نقل کی گئی ہے لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا گیا اس کا مآخذ کیا ہے.....؟

۵۔ صفحہ ۵۶ پر چوہدری عبدالحق کی کتاب ''زندگی'' پر نظم ۱۰ کا ذکر ہے، یہاں مصنف کا نام افضل حق ہونا چاہیے تھا۔

۶۔ مولانا ظفر علی خان کے مجموعۂ کلام 'حبسیات' کا تعارف لکھتے ہوئے (صفحہ ۶۵) اس کا سنہ اشاعت نہیں بتایا گیا، جب کہ منصور سٹیم پریس سے چھپنے والی اس کی اولین اشاعت کے سرورق پر جلی طور پر ۱۹۲۶ء درج ہے۔ ۱۱

۷۔ قادیانی جماعت کا ذکر کرتے ہوئے صفحہ ۷۰ پر حسرت موہانی کا ایک قول درج کیا گیا ہے کہ ''مولانا ظفر علی خان نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی اور ان پر یہ بات چونکہ واضح ہو گئی تھی کہ اس فرقۂ جدیدہ سے مذہبی نقصانات جتنے شدید ہیں اس سے زیادہ سیاسی نقصانات ہیں، اسی شدید احساس کی وجہ سے انہوں نے قلم سے نیزے کا کام لیا''۔ اس اقتباس کا مآخذ کیا ہے اور اس کے آغاز میں تو واوین درج ہیں لیکن اختتام پر نہیں۔ حسرت موہانی کا قول کہاں تک سمجھا جائے.....؟

۸۔ 'طوطی بولنا' کو بالعموم مذکر پڑھا ہے، آپ نے صفحہ ۷۴ پر لکھا ہے کہ ''اور داغ کی تو گویا طوطی بول رہی تھی'' کیا طوطی بولنا مونث ہے۔ راہ نمائی فرمائیں۔

۹۔ مولانا ظفر علی خان کی قصیدہ نگاری کے حوالے سے صفحہ ۸۴ جارج پنجم کی تعریف میں ان کے قصیدے کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام سے خارج کر دیا تھا۔ اس قصیدے کا متن اب کہاں دیکھا جا سکتا ہے.....؟ ۱۲

۱۰۔ مولانا ظفر علی خان کے مراثی اور نوحوں کے ضمن میں آٹھ شخصیات کے نام بتائے گئے ہیں جن کے سانحہ ارتحال پر مولانا نے مرثیے رنوحے لکھے یہ آٹھ شخصیات مولوی سراج الدین احمد، مولانا گرامی، داغ مرحوم، محمد اکبر خان، سید محمود، حبیب نور، مولانا محمد علی اور سر فضل حسین ہیں۔ اس فہرست میں علامہ اقبال اور چودھری افضل حق کا نام درج ہونے سے رہ گیا ہے، ان دونوں کی وفات پر لکھی گئی نظمیں مولانا کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ۱۳

۱۱۔ صفحہ ۸۵ پر درج مولانا ظفر علی خان کی تاریخ گوئی کے نمونوں میں بھی اضافہ ممکن تھا۔

۱۲۔ صفحہ ۱۰۴ پر جس ترجمان القرآن کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا مصنف کون ہے.....؟ ۱۴

۱۳۔ صفحہ ۱۱۳ پر مولانا ظفر علی خان کو مسلم لیگ کے بانیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ کیا محض اس بنا پر کہ وہ مسلم لیگ کے تاسیسی اجلاس میں شریک تھے انہیں لیگ کا بانی کہا جا سکتا ہے.....؟ جب کہ ۱۹۰۶ء کے اجلاس ڈھاکہ میں ان کی شمولیت بھی تحقیق طلب ہے۔

۱۴۔ آپ نے حبسیہ شاعری کے ضمن میں لکھا ہے کہ ''اختر علی خان کی بھی کئی غزلیں قید خانہ کی یادگار ہیں'' (صفحہ ۱۳۶) کیا ان کا کوئی ریکارڈ ہے، جب کہ میں نے تو یہ پڑھا ہے کہ اختر علی خان جیل خانے کے مشاعروں میں اساتذہ کے کلام پر ہاتھ صاف کیا کرتے تھے۔ ۱۵

۱۵۔ مولانا کے ذوق اسیری کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ''انہوں نے سبزی ترکاریاں اور درخت لگائے جو اب بھی جیل کے احاطہ میں سایہ فگن ہیں اور اس طرح انہوں نے اپنی یادوں کے چراغ سایہ دار درخت لگا کر جلا دیے'' (صفحہ ۱۳۸) یہ کون سے جیل خانے کا ذکر ہے.....؟ میں مولانا کے زندانی آثار تلاش کرتا ہوں، اس مقصد کے لیے سنٹرل جیل منٹگمری بھی گیا تھا لیکن ان کے آثار کا سراغ نہ ملا۔ دیوانِ غالب کا وہ نسخہ بھی نہ مل سکا جس کے بارے میں شورش کاشمیری نے لکھا ہے کہ مولانا نے اس کے سرورق کی پشت کے خالی صفحے پر ''شعر کیا ہے خیال کی تصویر'' والی نظم اور بعض دوسری نظمیں لکھی تھیں ۱۶۔

اسے لڑکپن کی نادانی ہی کہا جائے گا کہ یہ طول طویل خط لکھتے ہوئے احساس ہی نہ تھا کہ مکتوب نگار ایک خورد اور کم سواد طالب علم ہے جب کہ مکتوب الیہ ایک نہایت محترم اور بزرگ محقق ہے اور زیر تبصرہ کتاب ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا ایک حصہ ہے، بہر حال یہ طالب علمانہ استفسارات ڈاکٹر صاحب کو بھجوا دیے گئے۔ ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ اس طول کلامی کا جواب دیتے۔ کچھ عرصے بعد ہمارے کالج کا، جس میں احقر الیکٹریکل انجینئرنگ کے سال دوم کا طالب علم تھا، ملکی صنعتوں کا مطالعہ کا دورہ (Industrial Tour) درپیش ہوا۔ اس سفر میں پاکستان اسٹیل، ایکسائیڈ بیٹری، پاکستان کیبلز، سیمنس پاک، ہاشمی کین فیکٹری، فلپس (کراچی) پیل، اتفاق فونڈریز، پیکو (لاہور) تربیلا ڈیم (تربیلا) ہیوی مکینیکل کمپلکس (ٹیکسلا) وغیرہ اداروں کا مطالعاتی دورہ کیا گیا، ملکی صنعت کے مطالعہ کے اس سفر کی پہلی منزل کراچی تھی۔ دل اس خیال سے بلیوں اچھل رہا تھا کہ مطالعہ صنعت کے علاوہ میں کراچی کے نیشنل میوزیم کا ذخیرہ مخطوطات دیکھ سکوں گا، انجمن ترقی اردو کے خاص اور عام کتب خانوں میں جاؤں گا، ہمدرد کی لائبریری دیکھوں گا اور ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی صاحب سے مل کر مولانا ظفر علی خان کا وہ خط، جس کا ذکر انہوں نے اپنے گرامی نامے میں کیا تھا، حاصل کر سکوں گا۔ اس مطالعاتی دورے میں کراچی کا قیام سب سے طویل تھا، صنعتوں کے دورے کے بعد میں اپنی تمناؤں کی تکمیل کی فکر کرتا، بیچ کے وقفوں میں پاکستان سٹیل کی کالونی سٹیل ٹاؤن بھی چلا گیا تھا، شاید انہی دنوں میں ایک روز خاموشی سے ناظم آباد کا عزم کیا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ ناظم آباد کہاں ہے اور سٹیل ٹاؤن سے کتنی دور..... فقط یہ معلوم تھا کہ سٹیل ٹاؤن سے چلنے والی ایکسپریس بس صدر تک پہنچاتی ہے۔ نظیر حسنین زیدی صاحب کا پتہ تھام کر سٹیل ٹاؤن سے ایکسپریس بس میں سوار ہو گیا۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد صدر پہنچا اور یہاں پہنچ کر لوگوں سے ناظم آباد جانے کا طریقہ دریافت کیا، پتہ چلا کہ ناظم آباد ایک سے زیادہ ہیں اور مجھے ناظم آباد نمبر ۳ جانا ہے، بسیں اور ویگنیں بدلتا ہوا ناظم آباد نمبر ۳ پہنچ گیا۔ کتنے راہگیروں، مسافروں اور دکانداروں سے منزل مقصود کا نشان پوچھا یہ تفصیل نہ پوچھی جائے تو بہتر ہے۔ ناظم آباد نمبر ۳ میں عجیب ویرانی سی محسوس ہوتی تھی، قطار اندر قطار خوبصورت اور اونچے گھر گلیاں بنا رہے تھے مگر ان گلیوں میں راہ بتانے والے

نہیں تھے۔ جیسے تیسے ''المہدی'' کا نشان مل گیا، سرگودھا سے چلنے والا ایک مسافر بتائے صرف دو خطوں کے تبادلے کی اساس پر ایک محقق اور نقاد پروفیسر کے در دولت پر حاضر تھا۔ پیشگی اطلاع اور ٹیلی فونی رابطے کا اہتمام تو وہ کرتا جسے ان چیزوں کا شعور ہوتا۔ اب صاحب خانہ سے کوئی بھی جواب مل سکتا تھا: موجود نہیں ہیں، مصروف ہیں، پیشگی وقت طے کر کے آیئے یا پھر ملیں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ ارباب کرم اس طرح کے ضابطوں کے اسیر نہیں ہوتے، تعارف کروانے پر دروازے کھل گئے اور ڈاکٹر صاحب کا دیدار میسر ہوا، قسمت کی آزمائش ابھی جاری تھی کیا عجب ڈاکٹر صاحب مل کر بھی نہ ملیں اور کثرت کار یا اپنے کسی پروگرام یا چیزوں کی بے ترتیبی کا عذر کر دیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے وجود میں ایک نہایت مہربان خلیق اور شفیق ہستی چھپی ہوئی تھی، جو ایک نادان طالب علم کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر ظاہر ہوگئی، میرا مدعا انہیں معلوم تھا لیکن میرے سوالات متنوع تھے، جن کے جواب میں انہوں نے کمال فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے اپنے کتاب خانے کا دروازہ کھول دیا۔ ان کے ہاں میں نے پہلی بار مولانا ظفر علی خان کے 'پنجاب ریویو' کے عکس دیکھے، بعض باتیں انہوں نے زبانی بتائیں، مثلاً یہ کہ مولانا ظفر علی خان سے متعلق اپنے مقالے کو اشاعت سے پہلے مولانا ظفر علی خان کے سوتیلے بھائی اور پنجاب یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خان صاحب کو پیش کیا تھا تا کہ وہ بنظر اصلاح دیکھ لیں۔ انہوں نے صرف خاندانی حالات کا حصہ دیکھا اور اس میں بعض مشورے دیے۔ جہاں سے ظفر علی خان کا ذکر شروع ہوتا تھا وہ حصہ دیکھنا پسند نہ فرمایا۔ گجرات کے شیخ کرامت اللہ صاحب سے اپنی ملاقات کی روداد سنائی اور یہ بتایا کہ شیخ صاحب کے گھرانے سے مولانا کا تعلق شیخ صاحب کے دادا شیخ علی احمد مرحوم کے زمانے سے تھا، شیخ کرامت اللہ کی شادی میں کچھ روز باقی تھے کہ مولانا نے ان کی ہونے والی دلہن کا نام دریافت کیا جو حفیظہ تھا اس پر مولانا نے شیخ کرامت اللہ کو آٹوگراف دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے آٹوگراف میں لکھا گیا شعر سنایا تو ان کے تحقیق کے بارے ہوئے مخاطب نے شعر کی کسی مکتوبی صورت کا مطالبہ کیا، بزرگ محترم نے گستاخی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ڈائری نکالی اور شیخ کرامت اللہ سے ملاقات کی یادداشت مجھے دکھائی۔ وہاں لکھا تھا:

بہ نذر گرامی بیگم شیخ کرامت اللہ

حفیظہ کو خدا رکھے سلامت
سلامت اور وہ بھی باکرامت

ظفر علی خان ۱۷

کرم آباد

۱۰ر مارچ ۱۹۳۷ء

صرف یہی نہیں ان کی ڈائری سے مجھے کام کی ایک اور چیز ملی، یہ مولانا ظفر علی خان کی ایک تحریر تھی جو ان کے برادر خورد چودھری غلام حیدر خان مرحوم نے اپنی غیر مطبوعہ کتاب 'ظفر الملت' میں نقل کی تھی۔ ۳۰ر اپریل ۱۹۱۴ء کو لندن میں لکھی ہوئی یہ تحریر ان کی ایک کتاب کا ابتدائیہ تھی، چودھری غلام حیدر خان کے مطابق یہ کتاب ۳۹۵ ٹائپ شدہ صفحات پر مشتمل تھی جس کے پہلے صفحے پر یہ دو اشعار درج تھے:

دوست آنست کہ معائب او — ہم چو آئینہ رو برو گوید
نہ چو شانہ کہ با ہزار زباں — در پسِ پشت مو بمو گوید

یہ کتاب کبھی شائع ہوئی.....؟ مجھے اس میں شبہ ہے، تاہم ایک نادر تحریر کے طور پر میں نے ڈاکٹر صاحب سے ابتدائیے کا مطالبہ کیا، ازرہ کرم انہوں نے اجازت عطا فرمائی اور میں ان کی ڈائری لے کر ناظم آباد میں فوٹوسٹیٹ مشین کا پتہ پوچھتا ایک بار پھر گلیوں کی خاک چھاننے لگا، بالآخر فوٹوسٹیٹ مشین تلاش کرنے میں کامیابی ہوئی اور ان صفحات کے عکس بنوا لیے گئے ۱۸ اور ڈائری اسی وقت ڈاکٹر صاحب کو واپس کر دی گئی، اب میں نے اپنے اس خط کے جواب کا مطالبہ کیا جو 'مولانا ظفر علی خان بحیثیت شاعر' کے حوالے سے لکھا تھا مرحوم نے فرمایا آپ نے تو بال کی کھال اتاری ہے، آپ کی بعض باتیں ٹھیک ہیں۔

اس کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم سے کچھ مراسلت رہی لیکن افسوس کہ منقولہ بالا خطوط کے سوا ان کا کوئی اور خط کاغذات میں سے نہیں مل سکا۔ یہ یاد ہے کہ مکاتیب ظفر علی خان کی اشاعت پر ان کی طرف سے مبارک باد کا خط بھی آیا تھا، یہ خط بھی تلاش کے باوجود نہیں مل سکا، البتہ اس کا ایک اقتباس جو انہی دنوں ایک کتابچے میں نقل ہو گیا تھا، محفوظ رہ گیا ہے۔ مرحوم نے مکاتیب ظفر علی خان کی اشاعت پر مبارک باد دیتے ہوئے لکھا تھا:

''مکاتیب ظفر علی خان کی اشاعت ایک تاریخی واقعہ ہے۔ آپ کی تحقیق جستجو اور دقت نظر نہ صرف قابل داد بلکہ حیرت انگیز بھی ہے'' ۱۹

اپنی ان دنوں کی جدوجہد یاد آتی ہے تو درسا عت پر صائب اصفہانی کی آواز دستک دیتی محسوس ہونے لگتی ہے۔

در بیابان طلب راہ بری نیست مرا
سرِ پرواز بہ بالِ دگری نیست مرا

اپنے تحقیقی منصوبوں میں جن اصحاب سے تعاون متوقع تھا اکثر و بیشتر ان کی طرف سے مایوسی کا سامنا رہا۔ ایسے میں ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی صاحب جیسے تعاون کرنے والے بزرگ سے مل کر جو خوشی ہوئی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بعد کی زندگی کے تجربے بلکہ خود اپنے احوال پر نظر کرتا ہوں تو ڈاکٹر صاحب کے رویے کی عظمت کا احساس ہوتا ہے، ان سے ہونے والی ایک ہی ملاقات خاصی طویل تھی، اس پر اب دو عشرے گزر چکے ہیں لیکن ان کی شفقت اور کرم فرمائی کا نقش آج بھی تازہ ہے، اس ملاقات کے بعد بھی کسی نہ کسی صورت ان سے رابطہ رہا، انہوں نے مختلف اوقات میں اپنی کتابیں شخصیات اور مباحث اور حضرت اویس قرنیؓ ارسال فرمائیں، جب مشفق خواجہ صاحب کے ادارے سے ان کی کتاب مولانا ظفر علی خاں بحیثیت صحافی ۲۰ شائع ہوئی تو اس کی ایک اعزازی کاپی بھی ارسال فرمائی جس سے میں نے مولانا ظفر علی خان کی کتابیات ۲۱ تیار کرتے ہوئے مدد لی اور مذکورہ کتابیات میں اس کا اعتراف بھی کیا۔ اس وقت تک ڈاکٹر صاحب کی بینائی بہت کمزور ہو چکی تھی یہاں تک کہ ان کے لیے لکھنا پڑھنا ممکن نہیں رہا تھا چنانچہ اس کتاب پر اگرچہ ''محترمی و مکرمی جناب زاہد عمر صاحب ہدیہ نظیر حسنین زیدی ۹ر اپریل ۸۵ء'' کے الفاظ درج ہیں لیکن یہ ان کے اپنے دستِ خط میں نہیں ہیں۔ عدالت اور ضعف بصارت کے باوصف اپنے نیاز مندوں کو یاد رکھنا اور کتاب کا تحفہ بھجوانا اس تہذیب کی ایک علامت تھا، ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی جس کے ایک نمائندہ تھے۔ خورد نوازی اور وضع داری جس کے بنیادی اوصاف تھے۔ اپنی دم توڑتی تہذیب پر نظر کریں تو ایسے کردار تیزی کے ساتھ معاشرے سے رخصت ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

حوالے اور حواشی

۱ شورش کاشمیری ''قید فرنگ مولانا ظفر علی خان علیہ الرحمہ کے ایام اسیری'' لاہور: مطبوعات چٹان لمیٹڈ، فروری ۱۹۸۰ء، ص ۱۸۔۱۹

۲ زاہد منیر عامر ''مکاتیب ظفر علی خان'' لاہور: سنی پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء

۳ یہ نظم مولانا ظفر علی خان کے مجموعہ کلام ''بہارستان'' میں شامل ہے (لاہور: مکتبہ کارواں س ن، ص ۴۶۸) اور اس کے ساتھ مولانا نے ذیل کا نوٹ بھی لکھا:

''۱۶ جنوری ۱۹۲۵ء کو علامہ اقبال کی گائے نے بچھڑا دیا اور آپ کے آقائے نامدار اعنی میاں علی بخش صاحب جو مدتوں سے آپ کے شریک رنج و راحت چلے آتے ہیں ایک نہایت دیدہ زیب طشت میں گائے کی کھیس بھر کر اس پر اوراق نقرئی لگا کر اور پستہ کی ہوائیاں چھڑ ک کر دفتر زمیندار میں لائے، قاعدہ ہے کہ جب کسی عزیز کی طرف سے کوئی ایسا تحفہ پہنچے تو لانے والے کو انعام دیا جاتا ہے۔ میاں علی بخش کے لیے ان اشعار کا صلہ تجویز کیا گیا''۔

۴ ''ظفر علی خان ادیب و شاعر'' لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۶۷ء

۵ ظفر علی خان ''نگارستان'' لاہور: پبلشرز یونائیٹڈ، س ن، ص ۸۰، اس نظم سے پہلے بھی مولانا نے ایک نوٹ لکھا ہے جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

''مدینہ کے ایک کبوتر کی یاد میں جسے علامہ اقبال کے ارادت کیش ہاتھوں نے پالا تھا مگر ۲۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو ایک بلی کا شکار ہو گیا''

۶ نظیر حسنین زیدی، ڈاکٹر ''ظفر علی خان بحیثیت شاعر'' کراچی: انجمن ترقی اردو ۱۹۷۹ء، ص ۲۴۸

۷ دیکھیے ''مکاتیب ظفر علی خان'' ص ۳۱۹

۸ لاہور: مکتبہ کارواں، س ن

۹ ''خمستان حجاز'' لاہور: کتب خانہ مقبول عام، ۱۹۶۵

۱۰ ظفر علی خان ''نگارستان'' محولہ بالا، ص ۲۰۱

۱۱ سرورق کی پوری عبارت درج ذیل ہے: ''حسیات یعنی ان دل آویز نظموں کا مجموعہ جو حضرت مولانا ظفر علی خان مدظلہ العالی نے دوران قید فرنگ میں بمقام منٹگمری ارشاد فرمائیں۔ ۱۹۲۶ء میں زیر اہتمام سید لال شاہ صاحب منصور سٹیم پریس لاہور میں چھپ کر شائع ہوا، بار اول تعداد اشاعت ۲۰۰۰ء

۱۲ بعد میں یہ قصیدہ قادیانی اصحاب کی کتابوں میں مل گیا، خاص طور پر وہ کتاب جو ۱۹۵۳ء کی منیر انکوائری کمیشن کی رپورٹ کے جواب میں قادیانیت کا موقف پیش کرنے کے لیے شائع کی گئی۔

۱۳ ظفر علی خان ''چمنستان'' محولہ بالا ص ۱۷۷، اقبال پر ایک اور مختصر نظم اسی کتاب میں ص ۲۵۷ پر ہے۔ چودھری افضل حق پر دو نظمیں بہارستان (محولہ بالا، ص ۵۴۰، ۵۵۶) میں شامل ہیں، ان کی وفات پر بھی مولانا نے ایک نظم کہی تھی، رک روزنامہ نوائے وقت پاکستان، لاہور، افضل حق نمبر ۲۰ جنوری ۱۹۵۷ء

۱۴ مولانا ظفر علی خان نے تفسیر قرآن کے ارادے سے ستارہ صبح میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا جس کا عنوان ''ترجمان القرآن'' رکھا گیا تھا۔ (ستارہ صبح ۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء) مولانا ابوالکلام آزاد نے لگ بھگ ۱۹۳۱ء میں اپنی تفسیر قرآن ''ترجمان القرآن'' کے نام سے شائع کی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا رسالہ ترجمان القرآن کے نام سے ۱۹۳۲ء میں شروع ہوا۔

۱۵ سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم نے ایک مضمون میں اپنے ایام اسیری کی یادیں تازہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اختر علی خان نے ایک دفعہ معرکہ کی غزل سنائی، سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کچھ یاد سا آ گیا۔ میں نے اختر سے کہا میاں مقطع کہو وہ کسی قدر چھپا گیا۔ میں نے کہا تو لو پھر مجھ سے سنو مقطع تھا:

جو بے کسی سے ہو فرصت تو دو گھڑی کو چلو
امیر مسجد جامع میں آج امام نہیں

سب ششدر رہ گئے۔ ارے امیر مینائی کی غزل اڑا لی۔ سوالات کی ایک بوچھاڑ ہونے لگی۔ اختر علی خان مقطع کے ساتھ ہی بزم سے غائب ہو گئے دو دن روٹھے رہے۔ تیسرے دن بمشکل راضی کیا گیا۔ امیر مینائی کا دیوان ان کے تکیہ کے نیچے پڑا تھا۔ میں نے اٹھایا تو غزل کا صفحہ ہی پھٹا ہوا تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری میرا عقیدہ۔ قرآن کی محبت اور انگریز سے نفرت (مضمون) ہفت روزہ لولاک، فیصل آباد امیر شریعت نمبر مرتب: زاہد منیر عامر (مدیر اعزازی) مدیر اعلیٰ: مولانا تاج محمود جلد ۱۹، ش ۱۹، ۳ ستمبر ۱۹۸۲ء، ص ۱۱

۱۶ شورش کاشمیری ''قید فرنگ'' محولہ بالا، ص ۷۹۔۸۲

۱۷ ''مکاتیب ظفر علی خان'' محولہ بالا، ص ۳۰۰

۱۸ ایضاً، ص ۳۱۰۔۳۱۳

۱۹ یونس خیال، احمد شیر (مرتبین) ''زاویے'' (مکاتیب ظفر علی خان کے حوالے سے تنقیدی اور تاثراتی مضامین) لاہور: سنی پبلی کیشنز ۱۹۸۷ء، ص ۵۰

۲۰ کراچی مکتبہ اسلوب ۱۹۸۵ء، (ص ۲۵۶)

۲۱ زاہد منیر عامر ''مولانا ظفر علی خان'' کتابیات اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء

مقالہ نگاروں سے التماس

طبع شدہ یا کسی اور رسالے کو ارسال کردہ مقالے مخزن میں اشاعت کے لیے نہ بھجوائیں اور نہ ہی مخزن کو بھجوائے گئے مقالے اشاعت کا فیصلہ ہونے تک کسی اور رسالے کو ارسال کریں۔

مدیر

شان الحق حقی کی ادبی شخصیت

ڈاکٹر انور سدید

شان الحق حقی جو ادبی حلقوں اور خاندانی دائروں میں ''شان صاحب'' کہلاتے تھے، ۱۱ر اکتوبر ۲۰۰۵ء کو ٹورنٹو (کینڈا) میں فوت ہو گئے جہاں ان کے بچوں نے مستقل شہریت اختیار کر لی تھی۔ دو برس قبل ان کی بیگم سلمیٰ حقی کا کراچی میں انتقال ہو گیا تھا، اگرچہ آنگن بچوں اور پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن سلمیٰ حقی کی وفات نے ان کی زندگی کو ویران کر دیا۔ ادب تو پہلے بھی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا اور انہوں نے نظم و نثر کی بیشتر اصناف میں تخلیقی اور تنقیدی انداز میں خامہ فرسائی کی تھی لیکن بیگم حقی کی وفات سے معمولات حیات میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا، وہ پُر نہ ہو سکا۔ بچوں نے ان کی یہ حالت دیکھی تو اپنے پاس کینیڈا بلا لیا۔ اس دوران ہی میں معلوم ہوا کہ وہ پھیپھڑے کے کینسر میں مبتلا تھے اور مرض اتنا پھیل چکا تھا کہ قابو پانا مشکل ہو گیا۔ بہاول پور کے ممتاز ادیب عابد صدیق (مرحوم) کے صاحبزادے حافظ محمد صفوان چوہان کے ٹیلی فون پر رابطے میں تھے۔ چند روز قبل غریب خانے پر تشریف لائے تو انہوں نے بتایا کہ ''حقی صاحب کا مرض لاعلاج ہو چکا ہے اور وہ موت حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں''۔ پھر وہ خبر آ گئی جسے بادلِ ناخواستہ سننے کے لیے فضا تیار ہو چکی تھی۔

شان الحق حقی پاکستان کے ان ممتاز ادیبوں میں سے تھے جنہوں نے آزادی کے بعد ہند اسلامی تہذیب کے سب سے بڑے مرکز دہلی کو خیر باد کہا تو اپنے خاندان کی علمی، ادبی اور تہذیبی وراثت لے کر مچھیروں کی بستی کراچی میں آ گئے تو مستقل طور پر اس نئے دارالحکومت میں سکونت پذیر ہو گئے اور پھر اپنی علم دوستی، شیریں سخنی، منکسر مزاجی، وضعداری اور اردو ادب کی سچی لگن سے اس نقش کو مزید روشن کیا جس کی تابانی دہلی میں ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھی۔ حقی صاحب کا سلسلہ نسب شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے ملتا تھا۔ خاندان کے ایک رکن سیف الحق ادیب مرزا اسد اللہ خان غالب کے شاگردوں میں سے تھے، والد گرامی مولوی احتشام الدین حقی نامور عالم، زبان دان، لغت نگار، ادیب اور شاعر تھے۔ جن کی کتابوں میں ''مطالعہ حافظ'' ۔ ''افسانہ پدمنی'' اور ''ترجمان الغیب'' بہت معروف ہیں۔ شاعری میں ''نادان'' تخلص کرتے تھے، دیوان حافظ کا اردو منظوم ترجمہ ان کا ایک لازوال کارنامہ ہے۔ شان الحق حقی کا نسبی تعلق اسی خاندان سے تھا جس نے متحدہ ہندوستان میں علوم و معارف کی شعاعیں فراوانی سے بکھیریں۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے حقی صاحب کی کتاب ''نقد و نگارش'' کا پیش لفظ لکھا تو اعتراف کیا کہ:

> ''وہ دلی کی شرافت اور شائستگی کا نمونہ ہیں، ان کی رفاقت میں آپ کو احساس ہو گا جیسے چھاؤں میں بیٹھے ہیں، ان کا مطالعہ بھی وسیع ہے، عربی کے تھوڑے سے پس منظر کے ساتھ فارسی زبان زبان و ادب سے اچھی واقفیت، پھر اردو کے محاورے اور روزمرہ پر گرفت۔ وہ اردو کے ہندی عناصر کی اہمیت اور لسانی قدر و قیمت سے بھی خوب واقف ہیں۔ مجموعی طور پر انہیں ''اردو کلچر'' کا نمونہ کہا جا سکتا ہے''۔

شان الحق حقی ۱۵ ستمبر ۱۹۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ دو سال کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ پرورش کا بار گراں پھوپھی اور والد نے اٹھایا۔ ابتدائی تعلیم گوڑگاؤں، دہلی اور پشاور میں حاصل کی، بی اے علی گڑھ یونیورسٹی سے اور ایم اے انگریزی سینٹ اسٹیفن کالج دہلی سے کیا۔ عملی زندگی کا آغاز ۱۹۴۱ء میں بطور مترجم کیا، حکومت ہند کے ادبی اور سماجی رسالہ ''آج کل'' میں نائب مدیر کی خدمات انجام دیں اور مانیٹرنگ کے کاؤنٹر پروپیگنڈہ سیکشن میں کام کرنے لگے۔ اس دور میں ہی انہیں تحریک آزادی سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور سرکاری ملازمت سے برطرف کر دیے گئے تو شملہ اور کلکتہ کی غیر سرکاری ایجنسیوں میں کام کرنا شروع کر دیا جس کا فائدہ پاکستان آ کر اٹھایا، پہلے برٹش انفرمیشن سروس میں کام کیا پھر فلم اینڈ پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ میں ان کا انتخاب عمل میں آ گیا۔ ۱۹۶۵ء میں کولمبو پلان کے تحت لندن میں تربیت حاصل کی اور کئی یورپی ممالک کی سیاحت کی، پاکستان میں ٹیلی ویژن کا آغاز ہوا تو انہیں جنرل منیجر (سیلز) مقرر کیا گیا۔ سرکاری ملازمتوں کے دوران ہی حقی صاحب کو ترقی اردو بورڈ (جو اب اردو لغت بورڈ کے نام سے موسوم ہے) مجلس نظماء کا رکن مقرر کیا گیا۔ جہاں معتمد اعزازی کی خدمات انجام دیں، اس حیثیت میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۵ء تک کام کرتے رہے اور اردو لغت کے کارڈ بنانے کے لیے ہزاروں کتابوں کو خود کھنگال ڈالا اور لغت اشتقاق اور لسانی تبدیلیوں کی دریافت میں گہری دلچسپی لی اور اس بورڈ کی مجوزہ ۲۴ جلدوں پر مشتمل لغت کی نہ صرف منصوبہ بندی کی بلکہ اس کی ابتدائی جلدوں کی ترتیب و تدوین میں بھی عملی معاونت کی۔ حقی صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ ابتدا میں انہوں نے بچوں کے رسالے ہونہار میں مضامین لکھے، پہلا افسانہ شاہد احمد دہلوی کے رسالہ ''ساقی'' میں ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ پہلی تالیفی کاوش ''انتخاب ظفر'' ہے جو ۱۹۴۵ء میں انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کی۔ ادبی زندگی پر پورا نکھار پاکستان میں آیا جہاں اعلیٰ خدمات کا اعتراف سرکاری سطح پر بھی کیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء میں ''تمغۂ قائداعظم'' اور ۱۹۸۵ء میں ''ستارۂ امتیاز'' عطا کیا گیا۔

شان الحق حقی ادبی لحاظ سے جامع الحیثیات شخصیت تھے، انہوں نے دہلی کی شعری فضا سے اپنے ایام طفولیت میں اثرات قبول کیے اور غزل کی تخلیق میں دلچسپی لی۔ روایت ہے کہ اپنی چند غزلیں استاد بیخود دہلوی اور مولانا احسن مارہروی کو دکھائی تھیں۔ اپنی پہلی غزل ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ میں پڑھی۔ اس دور میں مشاعرے کی فضا میں حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، جوش، اصغر گونڈوی، بےخود دہلوی، سیماب اکبر آبادی، نوح ناروی اور سائل دہلوی جیسے شاعروں کا نام گونج رہا تھا، حقی کی غزل مبتدیانہ تھی لیکن اسے مناسب پذیرائی ملی تو انہوں نے سب سے پہلے غزل ہی کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا اور اس سے ''گیسوئے اردو کی شانہ کاری'' کا کام بھی لیا۔ ان کی غزل کا مزاج کلاسیکی ہے لیکن بقول نثار احمد فاروقی ''حقی کی شاعری نری تک بندی، قافیہ پیمائی اور لفظوں کی بازی گری نہیں ہے، شخصیت کا اظہار بھی ہے اور اردو کلچر کی مصوری بھی ہے''۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں جن کی داخلی موسیقی اور الفاظ کی نغمگی متاثر کرتی اور مضمون کو اجال دیتی ہے:

آنکھیں حسن سے رم کرتی ہیں، دل سے درد گریزاں ہے
وحشت ہوس کے آگے بس اک تنگ سی وادی امکاں ہے

شاید سجنے ہی کے لیے گیسوئے زیست پریشاں ہے
اچھا ہے رہے گر شغل جنوں یہ درد نہیں، خود درماں ہے

سامنے آئے آنکھ ملائے، دیکھوں کون پشیماں ہے
دکھ دے کر کیا شاد نہ ہو گا، انساں آخر انساں ہے

میں اک ذوق نظر کا مالک، کیا بخشوں کیا دان کروں
عالم سے عالم تک پھیلا، اک خالی سا داماں ہے

اچھا ہے ذرا دل گرم تو ہے اک گوشۂ پہلو نرم تو ہے
حقی شکوہ درد کا کیسا، درد تو تحفۂ یاراں ہے

حقی صاحب کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''تار پیرہن'' ۱۹۵۷ء میں اور ''حرف دلرس'' ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ ''دل کی زبان'' کے عنوان سے ان کی ایک سو غزلوں کا انتخاب بھی شائع ہو چکا ہے۔ چند برس پہلے غزل کے اساتذہ کی زمینوں میں غزلیں

کہنے کا سلسلہ شروع کیا تھا اور اسے ''استقبال استاداں'' کا عنوان دیا۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں:

جس نے اک خس کے لیے صحرا کو چھانا ہوئے گا کون ہو گا، کوئی ہم سا ہی دوانہ ہوئے گا (ولی دکنی کی زمین)
ہستی میں حقیقت کا کیا کھوج لگا چاہے کچھ دیر میں ہستی خود افسانہ ہوا چاہے (میر تقی میر کی زمین)
روندتے جاتے ہیں دنیا کے قدم میں ہوں حقی اور نقش آرائیاں (سودا کی زمین)
ہمیں دیکھو کہ منہ جس بت سے موڑیں اسی کے سامنے پھر ہاتھ جوڑیں (انشا کی زمین)
جس قدر چڑھتا گیا سر پہ ہمارے سورج اور سمٹا کیے سائے تری دیوار کے پاس (غالب کی زمین)
من بھاؤ کے اس ٹکراؤ میں حقی مان ہے تجھ کو کاہے کا یاں لوبھ میں اس کے لاکھوں ہیں تو جس کی آس لگاوے ہے (میر درد کی زمین)
طریقے دل نے دیکھے ہیں، ستم گاری کے ہاں ایسے کہ نشتر زہر ناک ایسے، نہ خنجر خوں فشاں ایسے (داغ کی زمین)

حقی صاحب نے متعدد متروک اصناف سخن کی تجدید امیر خسرو کے انداز میں کی اور ''کہہ مکرنیاں''، ''دو سخنے'' اور پہیلیاں بھی لکھیں جن کا مجموعہ ''نذر خسرو'' کے نام سے پیش کیا۔ یہاں ایک پہیلی پیش کی جاتی ہے، جو انسانی وجود میں اپنا ایک جیتا جاگتا کردار اور اپنی شخصیت رکھتی ہے:

کہنے کو تو وہ ہمسائیاں، تیور ایسے تیکھے جی چاہے تو روز لڑیں، پر ایک کو ایک نہ دیکھے
ساتھ رہیں اور ساتھ ہی گھومیں، پر آپس میں پردے کیا سمجھے؟ نابینا ہوں گی؟ نوج! خدا نا کردہ! (آنکھیں)

حقی صاحب نے ادب الاطفال کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ بچوں کے لیے نظموں کا ایک مجموعہ ''سہانے ترانے'' ۱۹۸۲ء میں چھپا جو کچھ اضافوں کے ساتھ ''پھول کھلے رنگ برنگ'' کے عنوان سے ۱۹۸۵ء میں حکیم محمد سعید کی ہمدرد فاؤنڈیشن نے شائع کیا۔ ان کی ایک انفرادی جہت شاعری میں تاریخ گوئی بھی ہے جس کے متعدد نمونے رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور سمعی اصناف میں سے ''غنائیہ نگاری'' کا تو انہیں بانی سمجھا جاتا ہے۔

شان الحق حقی نے نثر کی متعدد اصناف کو بھی اپنے زور قلم سے آراستہ کیا، بنیادی طور پر شاعر ہونے کے باوصف وہ ایک زیرک نظر اور بالغ فکر نقاد بھی تھے، تنقید میں ان کی دو کتابیں ''نکتہ راز'' (۱۹۷۲) اور ''نقد و نگارش'' (۱۹۸۵) شائع ہو چکی ہیں۔ اول الذکر کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اردو زبان، پاکستانی کلچر اور ادب اور ادیب کے مسائل پر حقی صاحب نے اپنے منفرد نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے مضامین لکھے ہیں۔ دوسرے حصے میں غالب، بہادر شاہ ظفر، میر انیس، اکبر الہ آبادی اور تلوک چند محروم کے علاوہ چند متفرق موضوعات پر عملی تنقید پیش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ''ادیب اور پیشہ وری'' میں افلاطون کا یہ قول زیر بحث آیا ہے کہ ''سماج میں شاعر کے لیے کوئی جگہ نہیں'' اس لیے اس نے شاعروں کو اپنی مثالی جمہوریت سے شہر بدر کر دینے کا مشورہ دیا ہے۔ ان کے پیش نظر اقوام متحدہ کے مرتب کردہ پیشوں اور حرفوں کا جائزہ بھی تھا جس میں ادیبوں کو ارباب نشاط اور دوسرے اہل فن کے ساتھ سامان تفریح مہیا کرنے والوں اور تماشا گروں (Entertainers) کے زمرے میں شامل کیا گیا تھا۔ حقی صاحب نے خیال ظاہر کیا:

> ''پیشے میں کوئی عیب نہیں، نہ اس میں چنداں مضائقہ ہے کہ شاعروں کا حشر و نشر دوسرے ارباب فن کے ساتھ ہو، خواہ ان میں نٹ اور مداری بھی شامل سہی لیکن اس تقسیم سے شاعر یا ادیب کے منصب کی پوری تعریف و تعیین نہیں ہوتی''۔

ان کی رائے میں:

> ''شعر و ادب فن تو ضرور ہیں اور ان سے انسان کو ذہنی آسودگی بھی ضرور حاصل ہوتی ہے لیکن یہ اس قسم کی آسودگی ہے جو حقیقت کے تجسس اور فطرت کے رازداں کو پانے سے حاصل ہوتی ہے''۔

مطلب یہ ہے کہ ارباب نشاط کی تفریح لمحاتی اور اکثر اوقات حواس کو آسودگی فراہم کرتی ہے لیکن ادب کا تخلیقی عمل نہ صرف ذہنی آسودگی کا باعث بنتا ہے، بلکہ فطرت کے بھیدوں کو منکشف کرنے اور حقیقت کی تلاش و جستجو میں بھی معاونت کرتا ہے۔ اس حوالے سے ادب جہاں ایک طرف ادیب کی ذات کا اظہار ہے وہاں دوسری طرف یہ انکشاف کائنات کا وسیلہ بھی ہے جو حال کے لمحے میں تخلیق ہوتا ہے لیکن ماضی کو روشن کرتا اور مستقبل کے امکانات کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔ ''اعلیٰ ادب ایسے تجربے کا ضرور حامل ہوتا ہے جو انسانی بصیرت میں اضافہ کر سکے''۔ ادب محض تفریح نہیں بلکہ ایک اعلیٰ مقصد کا حامل بھی ہے اور اس کا تاثر زمان و مکان کی قید کو بھی قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ انہوں نے شاعر کے تصورات کو منطقی افکار پر فوقیت دی اور لکھا کہ: ''تخلیق۔ حیات کا ایک مستقل اور بنیادی عمل ہے۔ فکر۔ اسے (تخلیق کو) سمجھنے اور جانچنے کی صرف کوشش ہے۔ منطق حقائق کو پرکھ سکتی ہے، پیدا نہیں کر سکتی''۔ اس مختصر اقتباس سے ظاہر ہے کہ حقی صاحب نے شاعر اور ادیب کو سماج میں باوقار مقام دینے کی وکالت کی ہے اور افلاطون سے برملا اختلاف کیا ہے جس کے قالب میں مفکر بھی موجود تھا اور شاعر بھی۔

حقی صاحب اس حقیقت سے آشنا تھے کہ ''ادب میں پیشہ وری کی سند و روایت ناپید نہیں..... اب سے پہلے وہ شعرا جو درباروں سے منسلک ہوتے تھے، وہ بے شک پیشہ ور شمار کیے جا سکتے ہیں ..... اور اس دور میں بھی ادیب کو پیشہ ور بنانے کی ترغیبات موجود ہیں'' لیکن انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے:

> ''آزادی فکر شاعر کا سب سے پہلا حق ہے۔ لہٰذا اس کا پیشہ ور بن جانا اس کی آزادی فکر کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا۔ ادب کوئی آزاد پیشہ نہیں، ادیب اپنا مال ناشر کو مہیا کرنے پر مجبور ہے اور ناشر اسے قبول یا رد کرنے کا مجاز ہے، پیشہ ور ادیب اشاعتی کاروبار کا صرف ایک فنی کاری گر ہی بن کر رہ سکتا ہے اور اس حیثیت سے آزاد نہیں ہو سکتا''۔

ان کا بنیادی موقف یہ تھا کہ ''ادیب کی پہلی ضرورت آزادی فکر ہے جو اسے ادیبانہ حیثیت میں ضرور حاصل ہونی چاہیے۔ پیشہ ور ادیب بن جانے میں اس پر کچھ خارجی ضوابط ضرور عائد ہوں گے جن کے بغیر پیشہ وری کا تصور نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً اس لیے کہ ادیب عام طور پر آجر نہیں صرف کاری گر ہی ہوگا'' دوسری طرف وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھے کہ ''ادیب ایک سماجی انسان بھی ہے اور اس کے معاشی اور معاشرتی مسائل بھی ہیں جن کے ساتھ باوقار زندگی گزارنے کے کڑے معاملات بھی منسلک ہیں، چنانچہ انہوں نے لازم قرار دیا ہے کہ: ''ادیب کو اپنے کمال کا نقش۔ فکر معاش اور کثرت کار کے ساتھ ہی ساتھ بٹھانا ہوگا اور کس حد تک ذوق ادب کو غم روزگار کے ساتھ ساتھ نبھانا ہوگا''۔ لیکن حقی صاحب نے معاشرے سے یہ تقاضا بھی کیا ہے کہ: ''اگر شاعر یا ادیب اپنے لیے ادب میں بڑا نام اور بڑا مقام پیدا کر لے تو جلد ہی اسے (معاشرتی) کام سے سبکدوش کر دیا جائے خواہ اس کا وظیفہ ادبی ادارے مقرر کریں یا حکومت۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ہی تصانیف سے روزی کما سکے اور وظیفے سے بے نیاز ہو جائے۔ جس طرح صلبی اولاد والدین کی کفیل ہوتی ہے اسی طرح ادیب کی معنوی تخلیقات بھی اس کی کفالت کر سکتی ہیں''۔

حقی صاحب نے ادبی معاشرے کے بارے میں یہ مقالہ ۱۹۶۳ء میں لکھا تھا، چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود مقالے کی معنویت اپنی جگہ قائم ہے اور ایسی صورت پیدا نہیں کی جا سکی کہ نامور معلم ادیبوں کو معاشرہ یا حکومت صرف

تخلیقی اور تحقیقی کام کے لیے مختص کر دے اور انہیں زندگی کی دوسری ضروریات سے نجات دی جائے۔ حقی صاحب خوش قسمت تھے کہ صلبی اولاد ان کی کفیل تھی اور انہوں نے زندگی کے آخری دور تک فعالیت کا ادبی ثبوت دیا ہمارے معاشرے میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ اسی اور نوے کے پیٹے کے ادیب بھی اجیر کی حیثیت میں مشقت اٹھا رہے ہیں۔

شان الحق حقی کی تنقید میں اردو زبان کے مسائل کو ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ ''نکتہ راز'' میں اردو زبان کے مسائل کے بارے میں جو مضامین ہیں ان کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ رسم الخط کی الجھن
۲۔ اردو الفاظ میں چھوت چھات
۳۔ زبان اور تعلیم زبان
۴۔ زبان وسیلۂ آشتی
۵۔ چند تعلیمی مسائل
۶۔ کرخنداری اردو

ان مضامین میں ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت میں انہوں نے متحدہ ہندوستان میں اردو کی تہذیبی اور پاکستان میں اس کی قومی ضرورت کو اجاگر کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ:

> ''مقامی بولیوں کی رنگارنگی ہی اردو کی بقا کا جواز پیدا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے اس کی بقا مقامی بولیوں پر منحصر ہے۔..... ہم اختلاف لسانی کے ضمن میں اس اشتراک کو بھول جاتے ہیں جو ان سب زبانوں میں موجود ہے۔ سب ایک اصل سے ہیں۔ وہی آریائی گھرانہ ہے۔ یہ اشتراک ان زبانوں کی ترکیب نحوی میں خاص طور پر نمایاں ہے، لفظ کی جگہ لفظ رکھیے اور جملہ خود بخود ایک زبان سے دوسری زبان میں ڈھل جاتا ہے''۔

بہت عرصہ پہلے ممتاز حسین نے لکھا تھا: ''زبان ان (حقی صاحب) کے نزدیک وسیلہ آشتی ہے۔ وجہ افتراق نہیں وہ اردو کی بین الاقوامی حیثیت کو مضبوط بنانا چاہتے ہیں اور لسانی تحقیق کو دوسری زبانوں سے رابطہ استوار کرنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ خود ان کے مقالے ''اردو الفاظ میں چھوت چھات'' اور ''کرخنداری اردو'' لسانی تحقیق کے نمونے ہیں''۔

حقی صاحب کی رائے میں ''تنقید ایک طرح کی جراحی، خوردبینی یا تجزیاتی عمل ہے اور ندرت بیان اس کے لیے لازمی نہیں لیکن یہ بات اپنی جگہ درست معلوم ہوتی ہے کہ ادبی تنقید کو ادبیت سے عاری نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خود ادب کا حصہ ہوتی ہے''۔ ان کی تنقید کی دوسری کتاب کو شگفتہ، فکر انگیز نگارشات کا مجموعہ قرار دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ''غزل کا سفر۔ سعدی سے اقبال تک''۔۔ ''غالب کے استعارات کا بھید''۔۔ ''اقبال کا نظریہ خودی کے اصل مآخذ''۔۔ میر انیس کی ڈرامہ نگاری''۔۔ اور ''قوم نظر کی 'سویدا' پر ایک نظر'' جیسے مضامین میں ادبیت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے اور نفس مضمون کو تحریر کا اصل جوہر سمجھ کر اسے ابھارنے کی سعی کی ہے۔ انہوں نے کفایت لفظی سے کام لیتے ہوئے اپنا نقطہ نظر اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری پر اس کا پورا مفہوم منکشف ہو جائے اور مشکل اصطلاحات کے گورکھ دھندے میں الجھ کر وہ بات محسوس نہ کرے جس کی طرف فیض صاحب نے حقی صاحب سے ایک ملاقات میں کہا تھا کہ:

> ''آج کل تنقید اور تذکروں کی زبان سپاٹ ہو گئی ہے۔ لطف بیان نہیں ملتا''۔

حقی صاحب کی تنقید تخلیقی زبان اختیار نہیں کرتی لیکن وہ اپنی بات کو 'گرہ دار' بنانے کی بجائے 'گرہ کھول' بنا کر پیش کرتے ہیں اور جہاں تسلیم و قبول کا مقام آئے تو وہ شاعر کی انفرادیت اور کارنامے پر قبولیت کی مہر لگانے میں بھی تاخیر نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''سب سے اہم بات جو اقبال کے ہاتھوں ہوئی وہ یہ کہ غزلیہ شاعری افسانے اور ڈرامے کی طرح تخیلی جگ بیتی رہی نہ رومانی آپ بیتی۔ بلکہ ذاتی افکار و عقائد کے اظہار اور پرچار کا ذریعہ بن گئی، اس کا لہجہ یکسر بدل گیا۔ انہوں نے ایسے اشعار کو جو پہلے غزل شمار نہیں ہو سکتے تھے، اس طرح غزلیہ اشعار کے پہلو بہ پہلو رکھا کہ وہ خود بخود غزل کے اشعار ہی تسلیم ہونے لگے۔ پہلے اس شعر کو کون غزل کا شعر کہتا:
>
> مغرب زتو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ — وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی
>
> مگر یہ غزل اس مطلع سے شروع ہوتی ہے:
>
> از مشت غبار ما صد نالہ برانگیزی — نزدیک تر از جانی با خوئے کم آمیزی
>
> اور اس شعر پر ختم ہوتی ہے:
>
> جز نالہ نمی دانم گویند غزل خوانم — ایں چیست کہ چوں شبنم، بر سینۂ من ریزی

یہ دونوں سوفی صد غزل کے اشعار ہیں، محبوب کو مخاطب کر کے کہے گئے ہیں۔ عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، خواہ عشق مجازی نہ سہی اور اس کے بعد کی اردو غزلیات سوفی صد کچھ کی کچھ ہو گئیں:

میر سپاہ نا ناسزا، لشکریاں شکستہ صف — آہ، وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف
تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں — ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

حقی صاحب نے اس نہج کے اشعار کو قطعہ بند یا نظم یا غزل مسلسل نہیں بلکہ فنی اعتبار صرف غزل ہی تسلیم کیا ہے کیوں کہ بقول حقی صاحب:

> ''اس کا ہر شعر اپنی جگہ فرد ہے۔ ان غزلوں میں..... ایک اجتہادی فکر اور مخصوص وجدانی تجربات کی ترجمانی ہے''۔

اس نوع کے اعترافات غالب، فانی، اکبر آبادی اور قیوم نظر پر لکھے گئے مقالات میں بھی جا بہ جا دستیاب ہیں جو کشادہ نظری اور ادب اور ادیب پر نگہ لطف ڈالنے کے مظہر ہیں۔ چنانچہ ان کا ایک قابل تعریف نکتہ یہ ہے کہ: ''ادب تنہا کسی فرد کی تصنیف نہیں ہوتا جس کے قلم سے نکلا ہو بلکہ پورے معاشرے کی تخلیق اور اجتماعی سائیکی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ادب معاشرے پر تھوپا نہیں جا سکتا جس طرح کہ اشتہارات یا سرکاری ہینڈ آؤٹ تھوپے جا سکتے ہیں۔ اس کا قبول کیا جانا شرط ہے''۔

حقی صاحب کی تنقید ان کے وسیع مطالعے اور زبان پر عبور کا قیمتی ثمر ہے۔ وہ پیشہ ور نقاد نہیں تھے لیکن یہ بات بھی عیاں ہے کہ وہ خود کو ادب پارے کی اجتماعی تخلیقی سائیکی کا حصہ تصور کرتے تھے اور ادب پارے کا جو مفہوم ان پر اترتا اسے بلا کم و کاست بیان کر دیتے تھے۔ یہ گہرا شعور نقد انھیں ایک نقاد بھی ظاہر کرتا ہے۔ وہ انگریزی ادب کے طالب علم رہے اس وسیلے سے ان کے ہاں تنقیدی بصیرت ملتی ہے۔

شان الحق حقی کی ادبی شخصیت کا ایک اور اہم زاویہ ان کی ترجمہ نگاری ہے۔ انہوں نے ایم اے انگریزی کیا تو اس زبان

کے ادب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور تنقید مغرب کے ساتھ ہی انگریزی زبان پر قدرت بھی حاصل کی، ایک دور میں تو ترجمہ ان کی رزق رسانی کا وسیلہ بھی بنا رہا۔ تاہم شیکسپیئر کا ڈرامہ ''انطونی کلوپطرہ'' کا ترجمہ ان کا منفرد کارنامہ ہے۔ حقی صاحب نے اسے قافیے کی پابندی کے ساتھ اردو نظم میں منتقل کیا ہے۔ ان کے دوسرے تراجم میں چانکیہ کا ''ارتھ شاستر'' بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ اور جیک شافر کا ایک انگریزی ناول بھی شامل ہے۔ عالمی شاعری کی مختلف زبانوں میں ۱۲۵ منتخب منظومات کا ترجمہ ''درپن در پن'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ کچھ منظوم تراجم ان کے اولین شعری مجموعہ ''تار پیرہن'' میں بھی شامل ہیں۔

رسائل کی ادبی ادارت کے سلسلے میں دہلی کے رسالہ ''آج کل'' میں ان کی خدمات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ پاکستان میں انہوں نے ادارہ مطبوعات پاکستان کے نگران کی حیثیت میں رسالہ ''ماہ نو'' کے مدیر اعلیٰ کی خدمات انجام دیں۔ ترقی اردو بورڈ کے تحت ایک ادبی جریدہ شائع کرنے کا منصوبہ بنا تو سہ ماہی ''اردو نامہ'' جاری کیا گیا جس کی ادارت کے فرائض حقی صاحب نے انجام دیئے۔ اس پر مستزاد ''نشید حریت''۔۔ ''خیابان پاک'' اور ''صور اسرافیل'' کے علاوہ ''نئے بنگالی افسانے'' جیسی کتابوں کی تالیف ہے۔

شان الحق حقی نے اپنی پوری زندگی ایک ادب نواز عالم کی حیثیت میں گزاری۔ انہوں نے پاکستان کو بنتے ہوئے اور پھر ٹوٹتے ہوئے بھی دیکھا۔ ان کی ذاتی زندگی میں بھی کئی جز رو مد آئے جن کا سامنا انہوں نے جرأت اور جواں مردی سے کیا لیکن نہ کبھی صلہ وستائش کی پروا کی، نہ شہرت ونمود کی۔ خودنوشت سوانح حیات ''افسانہ در افسانہ'' کے عنوان سے ماہنامہ ''افکار'' کراچی میں چھپ چکی ہے۔ ان کی نثر میں دہلی مرحوم کا روزمرہ جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا ایک سنجیدہ زاویہ افسانوں کے مجموعہ ''شاخسانے'' میں اور طنز ومزاح کا زاویہ مضامین کے مجموعہ ''آوارہ لمحے'' میں دستیاب ہے۔

ان کا شمار ان نامور ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو زبان وادب کی خدمت کو اپنی پوری زندگی کی اہم ترین سرگرمی قرار دیا۔ ان کی خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ انہوں نے ادب کو ''کیریر'' کے طور پر قبول نہیں کیا۔ اگرچہ رزق حیات سرکاری محکموں سے وابستہ تھا جہاں وہ دن بھر دفتر کے غیر ادبی نوعیت کے کام انجام دیتے لیکن فرصت کے تمام اوقات اردو ادب کی بے لوث، بے ریا اور غیر منفعت بخش خدمت کے لیے وقف تھے۔ یہ خدمت انہوں نے زندگی کے آخری ایام تک انجام دی جس کی مثال رسالہ ''شب خون'' الہ آباد میں سلسلہ مضمون ''الف اور بے کی نوک جھونک'' سے دیا جا سکتا ہے۔ جس کی آخری قسط چند ماہ پہلے شائع ہوئی تھی۔

بیانیات کی اصطلاحات (فرہنگ)

ناصر عباس نیر

بیانیہ (Narrative)

کہانی سنائی، لکھی اور دکھائی جا سکتی ہے۔ یعنی کہانی اپنے پیرایہ اظہار کی رو سے رزمیہ، داستان، ناول، افسانہ اور ڈراما ہو سکتی ہے۔ سنائی جانے والی کہانی کو بعد ازاں لکھا بھی جا سکتا ہے، جیسے داستان اور دکھائی جانے والی کہانی کو پہلے لکھا بھی جاتا ہے، جیسے ڈراما۔ اس کے باوجود بیانیے کی اصطلاح سنائی اور لکھی جانے والی کہانی کے لیے مخصوص تھی۔ رزمیہ، داستان، ناول اور افسانے کو بیانیہ کہا جاتا رہا اور ڈرامے کو بیانیے میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ ڈرامے میں دکھائے جانے کا عمل حاوی ہوتا ہے اور دیگر اصناف میں کہانی بیان کرنے کا عمل غالب ہوتا ہے۔ مگر اب بیانیے کی اصطلاح میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ ماہرین بیانیات (Narratologist) بیانیے میں کہانی کی تمام چھوٹی بڑی شکلوں کو شامل کرتے ہیں، خواہ ان کا کوئی پیرایہ بیان ہو، کوئی ذریعہ ہو اور کوئی مقصد ہو۔ چناں چہ بیانیے میں نظم ونثر، زبانی اور تحریری، تصویری، فلمی، ڈرامائی۔۔۔ کہانی کی تمام شکلیں سما گئی ہیں۔ رولاں بارت نے فرانسیسی ادبی رسالے ''کمیونی کیشنز'' کے شمارہ نمبر ۸ میں بیانیے کی وضاحت میں لکھا ہے کہ بیانیے کی بے شمار صورتیں ہیں اور یہ صورتیں کئی ذرائع سے اپنا اظہار کرتی ہیں۔ اس نے بیانیے میں اسطورہ، لجنڈ، حکایت، افسانہ، رزمیہ، المیہ، طربیہ، فلم، مصوری، حتیٰ کہ خبر اور فیچر کو بھی شامل کیا ہے۔ دیگر مفکرین جیسے تودوروف اور ژرار ژنیٹ نے بھی بیانیے میں کہانی کی سب ممکنہ شکلوں کو شامل کیا ہے۔ یوں بیانیے کو کہانی سے متعلق کر دیا گیا ہے اور اسے تمام تجزیاتی اور وضاحتی تحریروں کی مخالف اصطلاح کے طور پر برتا جا رہا ہے۔

دراصل بیانیے کی اصطلاح میں اسی طرح کی Inclusiveness ہے، جس طرح کی ساختیات میں ہے۔ ساختیات کلیت پسند ہے اور یہ متنوع ومتعدد مظاہر کے عقب میں کارفرما مشترک ساخت/پیٹرن کو دریافت کرتی ہے۔ کہانی بھی ایک پیٹرن ہے، جو متعدد ومتنوع بیانیہ پیرایوں میں قدر مشترک کے طور پر موجود ہوتا ہے۔

بیان کنندہ (Narrator)

کہانی چوں کہ بیان کی جاتی ہے، اس لیے (اصول علت کی رو سے) اسے کوئی نہ کوئی بیان کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ بیان کنندہ پر فی الفور مصنف کا گمان ہوتا ہے مگر حقیقتاً بیان کنندہ، کہانی بیان کرنے کا وسیلہ ہے، جسے مصنف کہانی کی نوعیت کی مناسبت سے اختیار کرتا ہے۔ لہٰذا بیان کنندہ مصنف نہیں، مصنف کی تخلیق ہے۔ بیان کنندہ کہانی کا کردار بھی ہو سکتا ہے اور کہانی کے عمل میں شریک بھی اور کہانی کے واقعات کا محض ناظر بھی!

افلاطون نے کہانی بیان کرنے کے دو طریقوں میں فرق کیا تھا۔ ایک کو نقل نگاری یا Mimesis کہا اور دوسرے کو

واقعہ نگاری یا Digesis کا نام دیا۔ نقل نگاری میں بیان کنندہ، کہانی کے بیان میں خود شامل رہتا ہے۔ وہ خود کسی واقعے یا کسی کردار کی نقل کرتا ہے۔ جب کہ واقعہ نگاری میں بیان کنندہ کہانی سے خود کو الگ رکھتا ہے۔ وہ ایک غیر جانب دار ناظر اور گواہ ہوتا ہے۔ بعد ازاں ان دو طریقوں کے لیے ''نقطہ نظر'' یا View Point کی اصطلاح وضع ہوئی اور اس سے مراد کہانی میں بیان کنندہ کی ''پوزیشن'' لیا گیا۔ یعنی آیا وہ کہانی سے خود کو الگ رکھتا ہے یا کہانی میں شامل رہتا ہے؟ اگر وہ خود کو الگ رکھے گا تو واحد غائب کے صیغے میں کہانی بیان ہوگی (جیسے منٹو کی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'') اور اگر خود کو کہانی میں شامل رکھے گا تو واحد متکلم میں کہانی بیان ہو گی (جیسے غلام عباس کی ''بہروپیا'')۔ اگر ''نقطہ نظر'' کی اصطلاح کا مقصد کہانی میں بیان کنندہ کی پوزیشن اور عمل کی وضاحت کرنا ہے تو یہ وضاحت نہیں ہوئی۔ مثلاً اس اصطلاح سے یہ موٹا سا فرق تو سمجھ میں آتا ہے کہ کہانی ''میں'' یا ''وہ'' کے صیغے یا ان دونوں کی ملی جلی صورت میں بیان ہوئی ہے، مگر یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ ''میں'' کا کہانی میں کردار فعال ہے یا نہیں؟ ''میں'' کہانی کا کبیری کردار ہے یا ضمنی اور معاون؟ وہ کتنا نمایاں اور کتنا مخفی ہے؟ اسی طرح کے سوالات ''وہ'' کے سلسلے میں بھی تشنہ جواب رہتے ہیں۔ چناں چہ ژرار ژینٹ نے ان کی جگہ متجانس بیان کنندہ (Homodigetic Narrator) اور غیر متجانس بیان کنندہ (Heterodigetic Narrator) کی اصطلاحات تجویز کی ہیں۔ یعنی بیان کنندہ دو ہی قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو کہانی میں شامل رہتے، دوسرے وہ جو کہانی سے باہر رہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کہانی میں بیان کنندہ کی شناخت کیوں کر ہو؟ کیسے پتا چلے کہ بیان کنندہ محض راوی ہے یا کہانی کا کردار ہے؟ اس سوال کا جواب کیا، کیسے اور کیسے پر غور کرنے سے مل جاتا ہے۔ بیانیے کا موضوع کیا ہے، موضوع کو کس اسلوب میں پیش کیا گیا ہے اور بیانیے کا مخاطب کون ہے؟ ان باتوں کا جواب پانے سے بیان کنندہ کی شناخت ہو جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ موضوع، اسلوب اور مخاطب کہانی کی بیانیہ تکنیک کو متعین کرتے ہیں۔ ہرمن ہیسے کے ناول "The Journey to the East" کا موضوع داخلی روحانی سفر ہے، مشرق روحانیت کی علامت ہے، اس کا اسلوب نیم رومانی، نیم حقیقت پسندانہ ہے اور اس کے مخاطب وہ قارئین ہیں جو مشرق کا تاریخی تہذیبی علم رکھتے اور داخلی اوڈیسی کا ذوق رکھتے ہیں۔ ان امور کی وجہ سے اس ناول کا بیان کنندہ متجانس ہے، جو متکلم کے صیغے میں کہانی بیان کرتا ہے۔ روحانی سفر کی روداد صرف وہی بیان کر سکتا ہے جو اس تجربے سے گزرا ہو، جس پر کشف کا نزول ہوا ہو یا جسے واردات نصیب ہوئی ہو۔ چوں کہ ناول کا ''میں'' تجربے سے گزرا ہے اور تجربے کی نوعیت روحانی ہے، اسی لیے ناول کے اسلوب میں حقیقت اور رومانیت کا امتزاج ہے، اور بیان کنندہ ناول کا کبیری کردار (Protagonist) ہے۔

بیان کنندہ کی بیانیے میں موجودگی کبھی مخفی (Covert) اور کبھی عیاں (Overt) ہوتی ہے۔ مخفی اور عیاں ہونا بیان کنندہ کی عدم فعالیت یا فعالیت پر دال نہیں ہے۔ بیان کنندہ مخفی رہ کر بھی کہانی کے عمل میں فعال کردار ادا کر سکتا ہے۔ بالخصوص رومانی اور تجزیہ ذات پر مبنی بیانیوں میں بیان کنندہ کا رول فعال ہوتا ہے جن میں فضا بندی اور صفات کے استعمال سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ بعض اوقات بیان کنندہ عیاں ہوتا ہے، مگر کہانی کے عمل میں اس کی شرکت نہیں ہوتی۔ اس کی مثال غلام عباس کا افسانہ ''سرخ جلوس'' ہے۔ یہ متکلم کے صیغے میں لکھا گیا ہے اور متکلم پوری کہانی میں بیّن طور پر موجود ہے، مگر کہانی کے واقعاتی سلسلے میں اس کا رول یکسر غیر اہم ہے۔

بیانیات (Narratology)

افسانوی ادب کی تنقید کے لیے پہلے ''فکشن کی تنقید'' کی ترکیب مستعمل تھی۔ پھر کرکشن (Criction) کی اصطلاح وضع ہوئی، مگر اس کا چلن نہ ہو سکا۔ فی زمانہ ''بیانیات'' کی اصطلاح رائج ہے اور اسی کو سکہ رائج الوقت سمجھنا چاہیے۔

بیانیات بیانیے کی سائنس ہے۔ یہ بیانیے کی ساخت، شعریات کو دریافت اور مرتب کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسے ساختیات کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے۔

بیانیات یا Norratology کی اصطلاح سب سے پہلے تو دو روف نے ۱۹۶۹ء میں اپنی کتاب "Grammaire du D'ecameron" میں استعمال کی، مگر اس علم کی تشکیل کا ابتدائی کام ۱۹۶۶ء میں شروع ہوا۔ جب فرانسیسی رسالے ''کمیونی کیشنز'' نے ''بیانیے کا ساختیاتی تجزیہ'' کے نام سے خصوصی نمبر چھاپا تھا اور بیانیے کی ساخت کی تفہیم کا آغاز اس سے بھی پہلے ہوا، بالخصوص روسی ہیئت پسندوں کے یہاں۔ روسی ہیئت پسند ولادی میر پراپ کی کتاب ''مارفولوجی آف فوک ٹیلز'' (جو ۱۹۲۸ء میں ماسکو میں چھپی، ۱۹۶۸ء میں جس کا انگریزی ترجمہ ہوا اور اردو والوں تک جس کی خبر چند سال پہلے پہنچی) میں بیانیے کے اس تہ نشین نظام کو دریافت کرنے پر توجہ دی گئی ہے، جو تمام قسم کے بیانیوں میں مضمر اور کارفرما ہوتا ہے۔ اور اسی تہ نشین نظام کی وجہ سے کوئی تحریر بیانیے کے طور پر قائم ہوئی ہے۔ پراپ نے لوک کہانیوں کو تمام کہانیوں کا پروٹوٹائپ قرار دیا۔ یعنی اگر لوک کہانی کی شعریات مرتب ہو جائے تو اس کی مدد سے بیانیے کی تمام قسموں کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ اس نے لوک کہانیوں کے اکتیس وظائف اور ان کے سات دائرہ ہائے عمل بتائے اور واضح کیا کہ یہ وظائف اور دائرہ ہائے عمل ہر قسم کے بیانیوں میں ہوتے ہیں۔

روسی ہیئت پسندوں کے کام کو فرانسیسی ساختیات پسندوں، لیوی اسٹراس، اے جے گریماس، رولاں بارت، تودوروف، ژراژنیٹ اور امریکی ساختیاتی نقاد جوناتھن کلر نے آگے بڑھایا۔ ان لوگوں نے بیانیے کا مطالعہ اسی طرح کیا جس طرح ماہرین لسانیات زبان کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ لفظوں کے معانی بتانے کے بجائے اس کے قاعدوں اور ضابطوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ علمائے بیانیہ نے بھی بیانیے کے تجزیے میں اس کی گرامر کو گرفت میں لینے کی کوشش کی کہ یہ ''گرامر'' ہی ہے جس کی وجہ سے کوئی تحریر بیانیے کے طور پر اپنی شناخت قائم کرتی ہے اور بیانیے کی سائنس کا موضوع وہ بنیادی اصول ہی ہو سکتا ہے، جو نہ صرف تمام بیانیوں میں قدر مشترک کے طور پر موجود ہوتا ہے بلکہ جو بیانیے کی تمام و کمال وضاحت بھی کر سکتا ہے۔

اے جے گریماس نے پراپ کے کام کو ہی آگے بڑھایا۔ پراپ نے سات دائرہ ہائے عمل سے چھ اضدادی جوڑے بنائے۔ گریماس نے کہا کہ جس طرح زبان میں اضدادی جوڑے ہوتے ہیں: دن/رات، مرد/عورت، خیر/شر اور ان کے باہمی تخالف اور فرق سے ہم معنی تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح بیانیہ بھی ''زبان'' ہے، جس میں اضدادی جوڑے ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے ہی بیانیہ ''بامعنی وجود'' اختیار کرتا ہے۔ بیانیے میں i۔ موضوع بہ مقابلہ معروض، ii۔ مرسل بہ مقابلہ وصول کنندہ، iii۔ حامی بہ مقابلہ مخالف کے ثنویتی جوڑے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ پراپ، گریماس اور دیگر علمائے بیانیہ نے کرداروں کے بجائے ان تجریدی عوامل کی نشان دہی کی، جو کرداروں سمیت تمام بیانیاتی عناصر و اجزا کو کنٹرول کرتے ہیں۔

بیانیات میں سب سے زیادہ بیانیے کی اس ثنویت پر زور دیا گیا ہے، جو کہانی اور کلامیے سے عبارت ہوتی ہے۔ بیانیے کی ساخت، شعریات دراصل انھی دو سے مرتب ہوتی ہے، لہٰذا انھی کا تجزیہ کیا جانا چاہیے۔ بیانیات، بیانیے کی ہیئت و ساخت پر

مرکوز رہتی ہے اور بیانیے کے سماجی وثقافتی سروکاروں سے لاتعلق رہتی ہے اور اپنی لاتعلقی کی ریشنلائزیشن میں یہ دلیل لاتی ہے کہ بیانیے کا بہ طور بیانیہ وجود سماجی اور ثقافتی تناظر کا نہیں بلکہ بیانیے کے ہیئتی وساختی قوانین کا مرہون ہے۔ لہٰذا بیانیات کو اگر سائنس بننا ہے اور بیانیے کی حقیقت کو منضبط کرنا ہے تو اسے ہیئتی وساختی قوانین کو ہی مطالعے کا موضوع بنانا ہوگا، جن کی وجہ سے کوئی تحریر بیانیے کے رتبے کو پہنچتی ہے۔ بایں ہمہ ایک ایسی تھیوری کی بہ ہر حال ضرورت محسوس ہوتی ہے، جو بیک وقت بیانیے کی ساخت اور اس کے خارجی تناظر کا احاطہ کر سکے۔ جس کی مدد سے بیانیے کی شعریات اور اس کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی حوالوں کی وضاحت و تفہیم ہو سکے۔ جوناتھن کلر کسی ایسی تھیوری کے امکان کو رد کرتا ہے اور یہ رائے دیتا ہے کہ دو مختلف چیزوں کا امتزاج ممکن نہیں۔ ساخت اور تناظر متبائن ہیں، مگر کیا واقعی؟ یہ تو ثابت ہے کہ ساخت تناظر کو منقلب کر لیتی ہے۔ کسی صنف کے ساختی قوانین، خارجی تناظر کی شکل صورت بدل دیتے ہیں۔ مگر کیا تناظر ساخت پر اثر انداز نہیں ہوتا؟ کیا نیا ''ورلڈ ویو'' کسی صنف کی ہیئتی سطح پر تموج پیدا کر کے اسے کچھ نہ کچھ بدلنے پر مجبور نہیں کر دیتا؟ چناں چہ بیانیات میں ساخت اور تناظر کو اگر ایک اضدادی جوڑا ہی شمار کیا جائے تو بیانیے کی تھیوری جامع ہو سکتی ہے۔

بیانیات اس اعتبار سے انقلابی تھیوری ہے کہ اس نے فکشن کی تنقید کی ماقبل اصطلاحات کو بے دخل کر دیا ہے۔ کردار، پلاٹ، وحدت، تاثر، فضابندی، نقطہ نظر وغیرہ کی جگہ بیان کنندہ، کہانی، کلامیہ، نقطہ ارتکاز، مخاطب وغیرہ کی اصطلاحات متعارف کروائی ہیں۔ اول الذکر اصطلاحات میں (فکشن کیسا ہونا) چاہیے پر زور تھا، مگر اب (فکشن کیسا) ہے، کی تفہیم پر اصرار ہے۔

غیر متجانس بیان کنندہ (Heterodigetic narrator)

ژرار ژینٹ نے یہ اصطلاح وضع کی ہے اور اسے افسانوی تنقید کی پرانی اصطلاح ''واحد غائب بیان کنندہ'' (وہ) کے متبادل کے طور پر، مگر نسبتاً مختلف مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ غیر متجانس بیان کنندہ کچھ اس طور کہانی بیان کرتا ہے کہ کہانی آگے بڑھتی ہے، مگر وہ ایک ہی مقام پر کھڑا رہتا ہے۔ وہ ساحل پر کھڑا تماشائی ہوتا ہے، کہانی کے سمندر کی شانت سطح اور موج لہروں کا حال تو خوب جانتا ہے، مگر سمندر میں خود نہیں اترتا۔ وہ خود کو کہانی سے باہر رکھتا ہے، وہ ایک غیر جانبدار ناظر اور گواہ ہوتا ہے۔ کرداروں کی صورت حال (داخلی وخارجی) اور کہانی کے واقعات کو تو بیان کرتا چلا جاتا ہے مگر خود ان میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ وہ ہمہ بین ناظر (Omniscient) بھی ہو سکتا ہے اور فقط راوی بھی۔ پہلی صورت میں وہ سماجی اور نفسیاتی حقیقت نگاری پر مبنی فکشن میں جلوہ گر ہوتا ہے اور بہ طور راوی وہ داستانی طرز کی کہانی کہتا ہے۔

غیر متجانس بیان کنندہ کی پہچان چوں کہ کہانی سے اس کے باہر ہونے میں ہے اس لیے وہ متکلم اور غائب دونوں صیغوں میں کہانی کہہ سکتا ہے۔ ہر چند متکلم صیغے میں کہی گئی کہانی پر یہ گمان بالعموم ہوتا ہے کہ وہ متکلم ہی کی کہانی ہے۔ مگر کئی کہانیوں میں متکلم فقط راوی ہوتا ہے اور کہانی کے بیانیاتی سلسلے کو تو آگے بڑھاتا ہے، مگر کہانی کے واقعاتی تحرک میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اس کی مثال نیر مسعود کا افسانہ ''بن بست'' ہے۔ اس افسانے کا ''میں'' ہر چند کہانی میں شروع سے آخر تک موجود ہے، وہ اپنے بارے میں بہت کچھ کہتا بھی ہے، یوں نمایاں (Overt) ہے مگر اصل کہانی اس کی نہیں ایک عورت کی ہے جس کے گھر وہ ڈر کے مارے گھستا ہے۔ ''وہ'' کے صیغے میں تو متعدد افسانے اور ناول لکھے گئے ہیں جن کا بیان کنندہ کہانی سے خود کو الگ تھلگ رکھتا ہے۔

کہانی اور کلامیہ (Story and Discourse)

بیانیات کی مرکزی اور اہم ترین اصطلاحات ہیں۔ کوئی بھی بیانیہ دراصل کہانی اور کلامیے سے عبارت ہوتا ہے۔ کہانی اور کلامیے کو مخصوص اصطلاحی مفاہیم میں برتا گیا ہے۔

کہانی اور کلامیے میں اولاً فرق روسی ہیئت پسند نقاد ولادی میر پراپ نے کیا تھا۔ اس نے بالترتیب Fabula اور Sjuzhet کی اصطلاحیں برتیں۔ اول الذکر سے انھوں نے کہانی مراد لی اور آخر الذکر سے پلاٹ۔ کہانی کو ''زمانی ترتیب میں ہونے والے واقعات'' کے مفہوم میں برتا گیا اور پلاٹ سے مراد واقعات کی وہ ترتیب لی گئی ہے جو کسی بیانیے میں ظاہر ہوئی ہے۔ گویا کہانی پہلے موجود ہوتی ہے، دنیا میں حقیقی طور پر یا مصنف کی متخیلہ میں، پلاٹ اسے خام مواد کے طور پر بروئے کار لاتا ہے۔ پلاٹ، کہانی پر مصنف کے تخلیقی عمل کا ثمر ہے۔ پلاٹ اور کہانی کا فرق دراصل سوسیئر سے مستعار ہے۔ جس نے لسانی نشان کو دال اور مدلول میں تقسیم کیا تھا۔ کہانی مدلول اور پلاٹ دال ہے۔ کہانی مدلول کی طرح پنہاں ہوتی اور پلاٹ دال کی مانند سامنے اور عیاں ہوتا ہے۔ جس طرح دال مدلول کے خیال کو ہیئت عطا کرتا ہے، اسی طرح پلاٹ، کہانی کے بکھراؤ کو تنظیم اور ہیئت سے ہم کنار کرتا ہے۔ علم بیانیات کے فرانسیسی ماہرین نے کہانی اور پلاٹ کے لیے Recit اور Historie کی اصطلاحیں تجویز کیں، مگر انگریزی میں سٹوری اور ڈسکورس کے الفاظ رائج ہوئے ہیں۔

سٹوری اور ڈسکورس کو زیادہ تر کہانی اور پلاٹ کے مفہوم ہی میں لیا گیا ہے۔ تاہم ان میں بعض نئے اور نازک نکات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ بہ ظاہر کہانی (سٹوری) کو کلامیے پر اولیت حاصل ہے کہ کہانی پہلے موجود ہوتی ہے (دنیا میں یا مصنف کی متخیلہ میں) اور کلامیہ اس پر تصرف کا نتیجہ ہے، مگر بیانیے کے تجزیے میں اولیت کلامیے کو حاصل ہے۔ کلامیے کے ذریعے ہی ہم کہانی تک پہنچتے ہیں۔ دراصل کلامیہ کہانی میں کافی ردوبدل کرتا ہے۔ کہانی کے واقعات کی زمانی ترتیب کو بدل دیتا اور واقعات کی مکانیت کو تبدیل کر دیتا ہے۔ واقعات کے بیان میں کہیں تفصیل، کہیں اختصار، کہیں وضاحت اور کہیں ابہام اور استعارے سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طور کلامیہ کسی بیانیے کا اسلوب، ٹیکنیک اور نقطہ نظر ہے اور کہانی تک پہنچنے کے لیے ان تینوں کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔ سادہ لفظوں میں کہانی واقعات کا وہ سلسلہ ہے، جو زمانی اور تاریخی ترتیب میں رونما ہوئے ہیں اور کسی انجام تک پہنچتے ہیں۔ جب کہ کلامیہ ان واقعات کا بیان ہے اور بیان کئی طرح کے اسالیب (حقیقت نگاری، رومانوی، سادہ، تجزیاتی) تیکنیکوں (متجانس اور غیر متجانس بیان کنندہ) اور ورلڈ ویو کے تابع ہوتا ہے۔ لہٰذا کہانی ایک سادہ چیز ہے اور کلامیہ پیچیدہ ہے۔ کہانی کا خلاصہ کیا جا سکتا، مگر کلامیے کا نہیں۔ کہانی عمومی ہو سکتی ہے، مگر کلامیہ انفرادی ہے۔ یہ کلامیہ ہی ہے جو کسی بیانیے کو امتیازی اور انفرادی حیثیت سے ہم کنار کرتا ہے اور کلامیہ ہی دو مصنفوں کے بیانیوں میں فرق کرتا ہے۔

بیانیے کے تجزیے میں کہانی اور کلامیے میں فرق کیا جانا ضروری ہے۔ ان دونوں کو الگ الگ معرض تجزیہ میں لایا جا سکتا ہے۔ اگر توجہ کہانی پر ہو تو ان اصولوں کو گرفت میں لیا جا سکتا ہے جو واقعات کے سلسلے کو جنم دیتے اور انھیں مربوط کرتے ہیں۔ گویا بیانیے کی گرامر مرتب کی جا سکتی ہے۔ لوک کہانیوں، اساطیر داستانوں اور بعض ناولوں کے ساختیاتی مطالعات میں دراصل کہانی کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے اور اگر تجزیے کا موضوع کلامیہ ہو تو بیانیے کے معانی اور ورلڈ ویو کی وضاحت وتعبیر ہو سکتی ہے۔ جدید اور علامتی بیانیوں کا مطالعہ (جن میں کہانی کا واقعاتی عمل معدوم یا کمزور ہوتا ہے) ان کے کلامیوں پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ حقیقت نگاری پر مبنی فکشن کے تجزیے میں کہانی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا ان دونوں کا بیک وقت تجزیہ ممکن ہے؟ جوناتھن کلر کا

خیال ہے کہ نہیں۔ اس کے مطابق یا تو بیانیے کے ہیئتی قوانین کو یا اس کے معنیاتی عمل کو ہی معرض تجزیہ میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ سوال دراصل کلامیے اور کہانی کے تعلق کی نوعیت پر غور کرتے ہوئے پیدا ہوتا ہے۔ کلر کی رائے میں اگرچہ دونوں ایک دوسرے پر منحصر (Interdependent) ہیں، مگر دونوں ایک دوسرے کو (دوران تجزیہ) بے دخل بھی کرتے ہیں۔ بہ ہر کیف ایک ایسی تھیوری یا مطالعاتی حکمت عملی کی ضرورت ہے جو ان دونوں کو بیک وقت گرفت میں لے سکے۔

متجانس بیان کنندہ (Homodigetic Narrator)

ژرار ژنیٹ کے مطابق متجانس بیان کنندہ وہ ہے جو کہانی میں شامل رہتا ہے۔ پہلے اس کے لیے واحد متکلم (First Person) کی اصطلاح تھی۔ مگر اس سے یہ وضاحت نہیں ہوتی تھی کہ متکلم کا کہانی میں کیا کردار ہے؟ کیا وہ کہانی کا ایک کردار ہے یا محض ناظر، گواہ اور مبصر ہے؟ جب کہ متجانس بیان کنندہ کہانی کا ایسا راوی ہے جو خود کہانی کے عمل میں شریک بھی ہے۔ کہانی میں اس کی شرکت کئی طرح سے ہو سکتی ہے۔ فعال اور مرکزی کردار کے طور پر بھی اور ضمنی اور معاون کردار کی صورت میں بھی۔ مرکزی اور کبیری کردار کی صورت میں کہانی کے تمام واقعات اسی سے متعلق ہوتے اور کہانی کے دیگر کردار اس کے معاون ہوتے ہیں۔ نیز وہ کہانی کو اپنے مخصوص ویژن سے بیان کرتا ہے۔ ضمنی کردار کے طور پر وہ مرکزی کردار کے مقاصد کو آگے بڑھاتا یا کہانی کے واقعات پر تبصرہ کرتا ہے۔ متجانس بیان کنندہ متکلم اور غائب کے صیغوں میں کہانی بیان کر سکتا ہے۔ نیز وہ مخفی (Covert) اور عیاں (Overt) بھی ہو سکتا ہے۔

اگر متجانس بیان کنندہ متکلم اور عیاں ہو اور مرکزی کردار ہو تو مخصوص موضوعیت کا شکار ہوتا ہے۔ وہ دنیا اور کائنات کو یکسر شخصی اور داخلی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور بالعموم تجزیہ ذات کرتا ہے۔ نیر مسعود کے افسانے ''اکلٹ میوزیم'' سے یہ اقتباس اس کی عمدہ مثال ہے۔

> ''اگر یہ سب حقیقت میں ہوا ہوتا تو مجھ کو یہ فکر نہ ہوتی کہ ایسا کیوں ہوا۔ حقیقتوں پر میرا اختیار نہیں۔ اختیار تو خوابوں پر بھی نہیں، لیکن خواب میری ذاتی ملکیت ہیں اور اگر میں خواب میں کچھ دیکھتا ہوں تو خواہ میری سمجھ میں کوئی بات نہ آئے، مگر یہ سمجھ میں آنا چاہیے کہ میں نے یہ سب کیوں دیکھا''۔

جدید اور علامتی فکشن میں متجانس بیان کنندہ کا عمل دخل زیادہ ہے۔ رشید امجد کے بیشتر افسانوں کے بیان کنندہ متکلم، عیاں اور کبیری کردار ہیں۔

اگر بیان کنندہ متکلم ہی ہو، عیاں بھی ہو، مگر معاون کردار ہو تو بیانیے میں موضوعیت کم ہوگی اور شخصی ویژن کا اجارہ نہیں ہو گا۔ اس کی مثال منٹو کا افسانہ ''ممد بھائی'' ہے۔

متجانس بیان کنندہ اگر ''میں'' کے علاوہ ہو، مگر کہانی میں شریک بھی ہو تو اسے پہچاننا اور اس کے رول کا تعین کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ دراصل بیانیے کے پس منظر میں موجود ہوتا ہے اور اپنا اظہار مخصوص لفظیات، اشیا و مقامات کے علم، کرداروں کے داخلی اور خارجی احوال کے بیان، واقعات پر ردعمل اور اپنے لہجے کے ذریعے کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ اس کے آلات ہیں جن سے وہ بیانیے کو مخصوص صورت اور سمت دیتا ہے۔ اس بیان کنندہ کو مصنف سے گڈمڈ کرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ حالاں کہ یہ مصنف نہیں، مصنف کی ہی اختراع ہوتا ہے۔ بعض اوقات بیانیے میں مصنف بھی در آتا ہے، جب وہ کچھ ایسے تبصرے یا آرا ظاہر کرنے لگتا ہے، جو دراصل کہانی کے کرداروں کو ظاہر کرنے چاہئیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اس کی مثال ہیں۔ یہ بیانیے کا ایک بڑا فنی نقص ہے۔

مخاطب (Narrattee)

ہر کہانی کو کوئی بیان کرتا اور کوئی اس کا مخاطب ہوتا ہے مگر جس طرح بیان کنندہ مصنف سے الگ اور مختلف ہوتا اور ایک تخیلی شخص ہوتا ہے، اسی طرح مخاطب بھی قاری کے علاوہ ایک تخیلی وجود ہوتا ہے۔ تاہم اس تخیلی وجود کو قاری ہی گرفت میں لیتا ہے۔ دراصل کوئی کلام قاری یا سامع کے بغیر ممکن نہیں، خواہ یہ ''کلام'' زبانی ہو یا تحریری! 'زبانی کلام' کے سامعین تو سامنے اور حقیقی طور پر موجود ہوتے ہیں مگر 'تحریری کلام' کے قارئین/مخاطب صرف تخیلی طور پر وجود رکھتے ہیں اور یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کسی متن کو فی الواقعی پڑھتے ہیں۔ وولف گینگ آئسر انھیں 'اصل قاری' (Actual Reader) کہتا ہے۔ اور دوسرے وہ جو متن کے اندر مضمر ہوتے ہیں۔ ہر متن کی قرأت کے دوران میں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ متن کچھ مخصوص قارئین کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ احساس دراصل متن میں موجود اشاروں، حوالوں، تصورات وغیرہ سے ہوتا ہے۔ آئسر ان قارئین کو 'مضمر قاری' (Implied reader) کا نام دیتا ہے۔ یہ مضمر قاری دراصل مخاطب ہے۔ مخاطب کی اصطلاح جیرالڈ پرنس کی وضع کردہ ہے۔ مگر اس کا بنیادی مفہوم آئسر سے مستعار ہے۔

مخاطب درحقیقت وہ شخص ہے، جسے کسی بیانیے کا بیان کنندہ مخاطب کرتا ہے۔ بیان کنندہ کی طرح مخاطب کی شناخت بھی آسان نہیں ہوتی اور بیان کنندہ کی مانند ہی مخاطب بھی بیانیے کا کردار یا محض ایک خاموش سامع ہو سکتا ہے۔ وہ کہانی کے عمل کو متاثر کر سکتا یا بیانیہ متن کا فقط وصول کنندہ ہو سکتا ہے۔ مکتوبی اور خطابیہ انداز میں لکھے گئے بیانیوں کے مخاطب عام طور پر بیانیے کے 'کردار' ہوتے ہیں اور بیانیے کی ابلاغی سطح کو کنٹرول کرتے ہیں۔ جب کہ تجزیہ ذات پر مبنی، علامتی یا تجریدی بیانیوں کے مخاطب فقط وصول کنندہ ہوتے ہیں۔

مخاطب کی شناخت، جنس، صنف، پیشے یا طبقے سے زیادہ اس کی ذہنی سطح اور ورلڈ ویو کے حوالے سے ہوتی ہے۔

مرکب بیانیہ (Frame Narrative)

ایک بیانیے کے اندر جب ایک سے زیادہ کہانیاں ہوں تو اسے مرکب بیانیہ کہا جائے گا۔ مرکب بیانیے میں ایک مرکزی کہانی ہو سکتی ہے اور متعدد ضمنی کہانیاں، جنھیں مرکزی کہانی باہم مربوط رکھتی ہے۔ اس کی اہم مثال الف لیلہ ولیلہ کا بیانیہ ہے۔ اس کی سب کہانیوں کو شہرزاد کی کہانی جوڑے رکھتی ہے۔ شہرزار کی کہانی گویا ''فریم'' ہے جس میں ایک ہزار ایک راتوں کو کہی گئی کہانیاں جڑی ہیں۔ پنچ تنتر اور چاسر کی ''کنٹیر بری ٹیلز'' بھی 'فریم کہانیاں'' ہیں۔ مرزا ادیب کی ''صحرا نورد کے خطوط'' کو بھی اسی ضمن میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

مرکب بیانیے کی ایک اور صورت یہ ہے کہ ایک کہانی کے ساتھ ایک اور کہانی چلتی ہے۔ پہلی 'حقیقی' اور دوسری 'افسانوی' ہوتی ہے۔ یعنی پہلی کہانی میں، کہانی لکھے جانے کے دوران میں پیش آنے والے واقعات اور صورت حال کا بیان ہوتا ہے اور دوسری کہانی وہ ہے جسے لکھا جانا مقصود ہوتا ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال سٹرن کی Tristram Shandy ہے۔ اس میں ایک کہانی بھی ہے اور اسے لکھے جانے کی کہانی بھی ہے۔ اس نوع کا مرکب بیانیہ دراصل ''خود شعوریت'' کا مظہر ہوتا ہے۔ بیانیہ خود اپنے وجود کی نوعیت سے آگاہی کا سوال اٹھاتا ہے۔ یعنی حقیقت اور فکشن کا فرق اور ان دونوں میں تعلق کا سوال ابھارا جاتا

ہے۔ یوں اس طرز کے مرکب بیانیے کی جہت فلسفیانہ ہوتی ہے۔

نقطہ ارتکاز (Focalization)

ہر بیانیہ کسی نہ کسی زاویے سے بیان (Narrate) ہوتا ہے۔ یہ زاویہ اصطلاح میں Focalized کہلاتا ہے اور بیانیے کا (کسی زاویے سے) بیان کیے جانے کا عمل Focalization ہے۔ دراصل ہر بیان کنندہ خواہ وہ متجانس ہو یا غیر متجانس، مخفی ہو یا عیاں، کوئی نہ کوئی آئیڈیالوجی رکھتا ہے۔ اس کا مخصوص طبقاتی، تعلیمی، سماجی، نفسیاتی اور فکری پس منظر ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے بارے میں مخصوص ترجیحات اور اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ بیانیے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ بیانیے میں بعض باتوں پر زور دیتا اور بعض کو دباتا ہے، بعض کو تفصیل سے بیان کرتا اور بعض کو اختصار سے اور کچھ کو حذف کر دیتا ہے۔ اشیا، افراد اور صورت حالات سے متعلق وہ مخصوص تاثرات اور تعصبات کا کھلے یا ڈھکے چھپے انداز میں اظہار کر رہا ہے۔ اس طور وہ اپنے مخصوص نقطہ نظر اور آئیڈیالوجی کا اظہار کرتا ہے۔ یہی Focalization ہے۔ اس کی چار قسمیں ہیں۔

i۔ متعین: جب پورے بیانیے کو، اس کے تمام واقعات اور کرداروں کی صورت حال کو واحد اور مستقل نقطہ نظر سے بیان کیا جائے اور بیان کنندہ بھی واحد ہو۔ (نذیر احمد اور شرر کے ناول)

ii۔ متغیر: جب کردار اور بیان کنندے ایک سے زیادہ ہوں۔ واقعات متعدد ہوں اور کوئی متعین ''نقطہ ارتکاز'' نہ ہو۔

iii۔ تکثیری: جب ایک کہانی یا واقعے کو ایک سے زیادہ بیان کنندے بیان کریں اور اس واقعے کو اپنے اپنے انداز میں بیان کریں۔ اور نتیجتاً ایک سے زائد نقطہ ہائے نظر سامنے آئیں۔ کسی واقعے سے متعلق اخباری بیانیے، اس کی مثال ہیں۔

iv۔ جب ایک سے زائد کردار، ایک ہی کہانی کو ایک ہی زاویے سے بیان کریں یعنی جب Focalized Point تو ایک ہو، مگر مختلف کردار اس کی نمائندگی کر رہے ہوں۔ اس کی مثال غلام عباس کا آنندی ہے، جس میں بلدیہ کے متعدد ارکان ''زنان بازاری'' کے خلاف ایک ہی نقطہ نظر پر اتفاق کرتے ہیں۔

توضیحی کتابیات قائد اعظم لائبریری

۱۔ توضیحی کتابیات اصول فقہ	سید عبدالرحمٰن بخاری
۲۔ علوم حدیث	حافظ خبیب احمد
۳۔ گوہر نایاب	غلام احمد چوہدری
۴۔ توضیحی کتابیات حدیث	حافظ خبیب احمد

ادبی دبستان بحیثیت تہذیبی مراکز

پروفیسر عبدالمغنی

دبستان ایسے مکتب فکر کا نام ہے جو زندگی کی خاص قدروں پر مشتمل ہو اور جس کے معتد بہ تخلیقی و تعمیری ذہن کے افراد وابستہ ہوں، جن کا دائرہ کار کوئی حلقہ یا علاقہ یا پورا معاشرہ ہو اور ایک مدت تک اس کے اثرات محسوس کیے گئے ہوں۔ اس دبستان کو ہم سماج کا تہذیبی مرکز قرار دے سکتے ہیں، جو متعدد ہو سکتے ہیں۔ ایک وقت میں بھی اور مختلف اوقات میں بھی۔ لیکن یہ مرکزیت خیالات و اعمال کی حد بندی کے لیے نہیں شیرازہ بندی کے لیے ہو سکتی ہے۔ یہ معاملہ سند و اختیار کا نہیں، معیار و اعتبار کا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کا یہ شعر صحیح سمت میں رہنمائی کرتا ہے:

اقبال لکھنو سے نہ دلّی سے ہے غرض ہم تو اسیر ہیں خمِ زلف کمال کے

چناں چہ شاعر کا یہ بیان بالکل مبنی بر حقیقت ہے:

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند (اقبال)

اس طرح دہلی اور لکھنو کے علاوہ ایک تہذیبی مرکز لاہور بھی یقیناً ہے، جو بجائے خود ایک مستقل دبستان یا مکتب فکر ہے۔ اس مرکزیت میں تاریخ، جغرافیہ اور تہذیب کے متعدد عوامل شامل ہیں۔ ان عوامل کے پس منظر میں سیاست وقت بھی کام کرتی رہی ہے۔ دہلی کا دارالسلطنت ہونا تو معلوم و معروف ہے اور بقول میرؔ:

رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
لیکن میرؔ ہی کے لفظوں میں اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا

تب ''پورب کے ساکنوں'' نے لکھنو میں تہذیب کی وہ بساط مرتب کی جہاں خود میرؔ صاحب جامع مسجد دہلی کی سیڑھیاں چھوڑ کر جلوہ افروز ہوئے۔

اس کے بعد زمانے کی گردش نے لاہور کے قدیم شہر کو جدید افکار و خیالات کا تہذیبی مرکز بنا دیا، حالاں کہ سیاسی اقتدار کا انتظام اسی زمانے میں پہلے کلکتہ میں رہا، پھر طویل مدت تک دہلی میں۔ اس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات کلچر پالٹکس سے بھی زیادہ طاقت ور ثابت ہوتا ہے۔

عصر حاضر میں اس کی ایک مثال عظیم آباد ہے جسے بجا طور سے چوتھا دبستان کہا جا سکتا ہے، جو کبھی پاٹلی پترا تھا اور آج پٹنہ ہے۔ اسے سینچا تو راسخ و شاد نے، لیکن آزادی ہند کے بعد تقسیم ملک کے جھٹکوں کے باوجود یہاں بہ یک وقت شاعری، افسانہ اور تحقیق و تنقید نیز ضرو ظرافت کے بلند قامت عمایدین کے ساتھ ساتھ کام یاب لسانی تحریک کے باکمال عمل بردار بھی جمع ہو گئے۔ چناں چہ اس صوبائی دارالسلطنت میں علم و ادب اور اقدام و عمل کے وہ جلوے نظر آئے جو نادر و کم یاب ہیں:

ڈھونڈوں گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم (شاد عظیم آبادی)

ایک دبستان دکن کا بھی ہے، مگر قلی قطب شاہ اور اس کے دور کی دکنی بولی تو کیا، اردو زبان کے پہلے اہم شاعر ولی دکنی کی وجہ سے بھی نہیں، بلکہ نظام دکن حیدر آباد کی اس عظیم الشان خدمت زبان و ادب کے سبب جو عثمانیہ یونیورسٹی میں تمام علوم و فنون کا ذریعہ تعلیم و تصنیف اردو زبان کو قرار دینے کا ایک بے مثال کارنامہ ہے اور اس سے ایک وقیع مکتب فکر اور تہذیبی مرکز کی تشکیل ہوئی، جب کہ پورا برصغیر انگریزوں اور انگریزی کی غلامی کے دور سے گزر رہا تھا، گرچہ آزاد ہندوستان نے اس کارنامے کی قدر نہیں کی اور ایک قومی میراث کو ختم کر دیا۔

اکبر الٰہ آبادی کی اعلیٰ ظریفانہ شاعری اور الٰہ آباد یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ کی علمی و ادبی کاوشوں اور سرگرمیوں نے اس شہر کو بھی ایک تہذیبی مرکز اور دبستان بنا دیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ کے کمالات کے باوجود اس علمی ادارے کو ایک تہذیبی مرکز تو قرار دیا جانا چاہیے، مگر اس کو ایک مستقل و معین ادبی دبستان سمجھنے میں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ یہاں مختلف اوقات میں متضاد رجحانات کارفرما رہے ہیں۔ بہر حال یہ ایک سرچشمہ علم ہے، جس کے وسیع اثرات پورے برصغیر اور اس کے باہر بھی پھیلے ہوئے ہیں۔

کلکتہ بھی سیاست و تجارت کی ہنگامہ خیزیوں کے باوجود ایک علمی و تہذیبی مرکز رہا ہے، گرچہ ایک خاص دبستان ادب کی حیثیت سے اس کے اوصاف و مضمرات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

بمبئی پر معاشی کاروباروں اور فلمی اداکاروں کا اتنا زبردست قبضہ ہوا ہے کہ اس کا تہذیبی کردار مشتبہ ہو گیا ہے۔ بہر حال، اسے کوئی مخصوص دبستان کہنا بہت مشکل ہے۔ یہ تو گویا دبستانوں کی گزرگاہ ہے۔ اس کی سیاست اور صحافت کے ہنگامے کتنے ہی دل چسپ ہوں، اس کے طرز فکر کی تعیین دشوار ہے۔

مختلف اوقات میں کم از کم ایک مدت کے لیے چند دوسرے تہذیبی مراکز بھی بعض علاقوں میں بعض جہتوں سے سامنے آئے، جیسے حسب ذیل قدیم و جدید مقامات:

جون پور	اکبر آباد
رام پور	اسلام آباد
بھوپال	کراچی
بدایوں	کشمیر
مرشد آباد	

ان مراکز کو متعدد خدمات اور کمالات کے باوجود، جو یہاں مستقل یا عارضی قیام کرنے والے علماء، ادبا اور شعرا نے پیش کیے، دبستان فکر و فن قرار دیا جائے یا نہیں؟ یہ ایک سوال ہے جس پر بحث کی جا سکتی ہے۔

بہر حال، دبستان کا وجود ادب کی تصنیف پر مبنی ہے، زبان کی تشکیل پر نہیں، جس کے متعلق لسانیات کے ماہرین نے تحقیقات کی ایسی داد دی ہے جو کسی خاص نتیجے کا تعین نہیں کر سکی ہے۔ دکنی، پنجابی، اودھی، ہریانوی وغیرہ کی ساری بحثیں بے نتیجہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کا خمیر کسی ایک مقام یا علاقے سے اٹھا ہی نہیں۔ جنوبی سواحل سے شمالی وادیوں تک عربی و فارسی کے قافلے پورے برصغیر میں صدیوں تک آتے رہے اور رائج الوقت پراکرتوں سے مل کر عصر حاضر کی ایک بڑی زبان کا ریختہ اور سانچہ مختلف ناموں ...... ہندی، ہندوی، ہندوستانی سے تیار کرتے رہے، یہاں تک کہ یہ عوامی زبان ترقی پا کر اردوئے معلّیٰ با کول جمہوری طور پر، نہ کہ کسی فرمان شاہی سے، بن گئی اور انگریزوں نے انیسویں صدی کے وسط میں پہلی بار اسے سرکاری زبان قرار دے کر اس کی واضح اہمیت کا اعتراف کیا۔ اس لسانی حقیقت کا ایک ناقابل تردید ثبوت علامہ سید سلیمان ندوی کی ضخیم دستاویزی کتاب ''عرب و ہند کے تعلقات'' میں موجود ہے۔

لہٰذا دبستان کی ترکیب و ترتیب کا سراغ قواعد و محاورات اور املا و لغات کے بجائے علما، ادبا اور شعرا کی تصنیفات کے ذخیرے سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ انہی تخلیقی کارناموں سے فصاحت و بلاغت، معیار و اقدار کی تعیین ہوتی ہے اور کسی زبان کے ادب کی اہمیت و عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ غلط العام فصیح یعنی تسلیم شدہ ادبا کے لغات و قواعد کے اعتبار سے غلط لیکن عام استعمال الفاظ کو بھی قبولیت کی سند حاصل ہو جاتی ہے، اس لیے کہ وہ اپنے اعلیٰ معیار تصنیف کے سبب بجا طور سے دعویٰ کر سکتے ہیں:

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

یہ استناد عمومی و مجموعی استعمال سے حاصل ہوگا، اس لیے کہ الفاظ کی اصلیت جو بھی ہو، ایک مخصوص زبان کی خراد پر چڑھ کر علامہ سید سلیمان ندوی کے بقول وہ محاورہ زبان بن جائیں گے۔ اس طرح عربی و فارسی وغیرہ زبانوں کے بے شمار الفاظ کے معانی و تلفظات اردو میں کیمیائی طور پر تبدیل ہو گئے۔ اپنا مخصوص و ممتاز ادب رکھنے والی کسی زبان کی یہ تخلیقی کیمیاگری کسی مسلم الثبوت دبستانِ فکر و فن ہی میں اس کے اساتذہ کے ہاتھوں روبہ عمل آتی ہے۔

موجودہ زمانے میں اردو کی نو آبادیاں برصغیر سے باہر یورپ اور امریکہ تک میں پھیل گئی ہیں اور غیر منقسم ہندوستان سے تلاش روزگار میں گئے ہوئے اہل نظر نے تازہ بستیاں اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے والوں کی ملکوں ملکوں آباد کر لی ہیں۔ جہاں وہ اپنے سرمایے سے تقریبات منعقد کرتے رہتے ہیں۔ برصغیر کے اہل اردو کو بلاتے ہیں اور خود برصغیر کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ یہ سرگرمیاں خوش نما ہیں، مگر ان سے کسی دبستان یا تہذیبی مرکز کی تعمیر نہیں ہوتی اور زیادہ تر زر مبادلہ کے تبادلے سے سیاحت ہو جاتی ہے، جو نفع بخش ثابت ہوتی ہے۔ بہر حال اس کاروبار شوق سے اردو زبان و ادب کا چرچا دنیا میں پہلے سے کچھ زیادہ ہونے لگا ہے، گرچہ اصلیت و صلاحیت پر مبنی تخلیقی کمالات بہت کم سامنے آئے ہیں۔

آزادی ہند کے بعد دو خاص رجحانات کا غلغلہ بلند ہوا ہے۔ سب سے پہلے ترقی پسندی کے نام سے، جس کی بنیاد ۱۹۳۶ء میں پڑ چکی تھی، اشتراکی افکار کی اشاعت اور مصنفین کی سیاسی گروہ بندی اور اشتہار بازی ہوئی۔ اس کے بعد بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں رد عمل کے طور پر جدیدیت کی شورش برپا ہوگئی، جس نے ادبی قدروں کو تہ و بالا کر دیا۔ ایسے رجحانات کو فکر و فن کا تہذیبی کارنامہ قرار دینا بہت مشکل ہے اور انہیں کسی تعمیری دبستان کی تشکیل کے عناصر تسلیم کرنا بھی آسان نہیں۔

مندرجہ بالا حقائق کے مد نظر، تہذیبی مراکز کی حیثیت سے ادبی دبستانوں کی شناخت کے لیے حسب ذیل امور درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ زبان اور ادب کی فصاحت و بلاغت کے معیاری نمونے موجود ہوں۔

۲۔ ان نمونوں میں فکر و فن کی ہم آہنگی اور پختگی ہو۔

۳۔ اصلیت پر مبنی تخلیقی کمالات ہوں۔

۴۔ معتد بہ کمالات اعلیٰ پیمانے پر ہوں۔

۵۔ تہذیبی اقدار کا غلبہ ہو۔

۶۔ ہیئت و اسلوب کی ترقی ہموار و استوار ہو۔

۷۔ کلاسکی روایت میں انفرادیت کا تجربہ معنی خیز، پسندیدہ اور مقبول عام ہو۔

یہ شرائط مسلم الثبوت اور معروف و مقبول مکاتب و مراکز اور دبستانوں کے مشترکہ اوصاف ہیں جن میں کمی بیشی کا سوال نہیں اٹھتا، گرچہ مذکورہ حدود کے اندر اجتہاد و تجدید اور توسیع و ترقی کے دروازے حسب سابق کھلے ہوئے ہیں، بشرطے کہ جدت برائے جدت نہ ہو اور اس کی معقولیت و افادیت نمایاں ہو۔ مبینہ اوصاف باہم مربوط و مرکب ہیں اور صدیوں کے کمالات سے مرتب ہوئے ہیں۔ لہٰذا کوئی تجزیہ ان میں تحریف و تخریب کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ مقبول نہیں، مردود ہوگا۔ کامیاب نہیں، نامراد ہوگا۔ جیسے آزاد نظم اور تجریدی افسانہ، جن کا انجام ان کی تشہیر کے باوجود عبرت خیز ثابت ہوا ہے۔ بہرحال، ادبی دبستان بحیثیت تہذیبی مراکز ایک موضوع بحث ہے۔

قائداعظم لائبریری کی مطبوعات

۱۔ ابتدائی فلکیات	خالد مسعود	-/20 روپے
۲۔ پودوں کی زندگی	خالد مسعود	-/30 روپے
۳۔ مسلمان اور سائنس	خالد مسعود	-/30 روپے
۴۔ عالم حیوانات	خالد مسعود	-/20 روپے
۵۔ کرہ زمین	خالد مسعود	-/20 روپے
۶۔ کلیاں میرے گلشن کی	عبدالرحمٰن خالد	-/20 روپے
۷۔ اصطلاحات حدیث	محمد سعد صدیقی	-/80 روپے
۸۔ علم حدیث اور پاکستان میں اس کی خدمت	محمد سعد صدیقی	-/100 روپے
۹۰۔ اسلامی آداب	سید عبدالرحمٰن بخاری	-/100 روپے
۱۰۔ اسلامی قانون کا نظریہ مصلحت	سید عبدالرحمٰن بخاری	-/190 روپے

ملنے کا پتا: قائداعظم لائبریری باغ جناح لاہور۔ پاکستان

مکتوبات مشفق خواجہ

محمد حمزہ فاروقی

برسوں بعد میں جب مشفق خواجہ صاحب کے خطوط مرتب کرنے لگا تو مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی ماہر نفسیات کے عمل تنویم نے مجھے ماضی میں سفر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس دور کی تلخ و شیریں یادوں کا کارواں نظر کے سامنے گزرنے لگا اور یہ باور کرنا محال ہو گیا کہ خواجہ صاحب جیسا مخلص، شگفتہ مزاج اور زندہ دل انسان اس دنیا میں نہیں رہا۔

خواجہ صاحب کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ ان میں رند مشرب بھی تھے اور جماعت اسلامی کے ''متقی و صالح امیدوار'' بھی۔ اللہ جانے ان ''متقی و صالح امیدواروں'' کا علم و ادب سے کیا تعلق تھا۔ وہ اپنے ان ساتھیوں میں، جن میں علم و ادب کے ''جراثیم'' تھے علمی خدمت کی جوت جگاتے اور انہیں کام کرنے کی راہیں سجھاتے۔ وہ خود بھی جاہ و منصب اور خود نمائش سے بے نیاز رہے اور دوستوں سے بھی ادب کی بے لوث خدمت کے خواہاں رہے۔

زیر نظر خطوط سے خواجہ صاحب کی شخصیت کے بہت سے دل آویز پہلو نمایاں ہیں۔ مثلاً وضع داری، دوست داری، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور شگفتگی ہر ہر سطر سے نمایاں تھی۔ ان کے خیالات میں کہیں ابہام نہ تھا۔ انداز تحریر مکالماتی تھا۔ ان خطوں میں ان کی علمی پیاس نمایاں تھی۔ ان کے علمی و ادبی منصوبے اور اشاعتی پروگرام کا احوال بھی ان میں ملتا ہے۔ اپنے موضوع سے متعلق مخطوطہ یا کتاب کے حصول کے لیے مضطرب رہتے اور یہ اضطراب اس وقت تک برقرار رہتا جب تک وہ مختلف مراحل سے گزر کر ان تک نہ پہنچتی۔

جن شخصیات سے مثلاً ممتاز حسن، بشیر احمد ڈار اور خواجہ عبدالوحید (والد) سے انہیں تعلق خاطر تھا، ان کے متعلق پر خلوص جذبات کا اظہار ان خطوں سے ہوتا ہے۔ ان کے علمی ارتقا کے آئینہ دار بھی ایک حد تک یہ مکاتیب ہیں۔

آپ خط کا جواب فوراً دیتے تھے لیکن پاکستان کے ڈاک کے ناقص نظام کی بدولت ان کے بہت سے خط ضائع ہو گئے۔ آخر اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ ناظم آباد سے صدر آتے اور اپنے سامنے ان خطوں کو ''مہر زدہ'' کروانے کے بعد گھر لوٹتے۔

زیر نظر خطوط اس دور میں لکھے گئے جب راقم اسکول برائے علوم ترقی و افریقی SOAS میں ایم اے ایریا اسٹڈیز جنوبی ایشیا کا طالب علم تھا۔ خطوط کا دورانیہ اکتوبر ۱۹۷۷ء سے مارچ ۱۹۸۰ء تک پھیلا ہوا تھا۔ میں بعض نجی معاملات میں ان کے مشوروں اور علمی مسائل میں معاونت کا طالب رہا۔ خواجہ صاحب کے پر خلوص مشورے اور علمی معاون میرے بہت کام آیا۔)

﴿۱﴾

۳۔ڈی ۹/۲۶ ناظم آباد کراچی ۱۸

برادر مکرم و محترم حمزہ صاحب۔ سلام مسنون۔

یکے بعد دیگرے آپ کے دو خط ملے۔ اس عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ اتنی دور رہ کر بھی آپ نے مجھے یاد رکھا۔ یہ میری خوش بختی اور آپ کی خوش صفاتی ہے۔ جب سے آپ گئے ہیں، میں اپنے گھر کی سیڑھیوں سے نیچے نہیں اترا۔ باہر کی دنیا سے میرا تعلق آپ کے ذریعے تھا۔ یہ تعلق گو عارضی طور پر ختم ہو گیا ہے لیکن میں گزرے ہوئے اچھے دنوں کی یاد میں، آنے والے اچھے دنوں کا انتظار کروں گا، جب آپ دوبارہ یہاں تشریف لائیں گے۔ آپ نے جس عظیم مقصد کے لیے یہ بن باس گوارا کیا ہے، اس کے پیش نظر میری دعا ہے کہ خدا آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔

مکان کے سلسلے میں آپ کی پریشانیوں کی تفصیل پڑھ کر تشویش ہوئی۔ میری دعا ہے کہ اب تک آپ کو مکان مل چکا ہو۔ میں اس قسم کی مشکلات کے پیش نظر آپ کو مشورہ دیتا تھا کہ وقت مقررہ سے کم از کم ایک مہینہ پہلے آپ کو لندن پہنچ جانا چاہیے۔

اب آپ پچھلی باتوں کو ذہن سے نکال دیجیے۔ آپ کے ساتھ جس نے بھی برا سلوک کیا ہے، اسے معاف کر دیجیے۔ ماضی کی تلخ یادوں کو اپنے ذہن و قلب سے دور رکھیے۔ آئندہ کی فکر کیجیے۔ علمی ترقی ہر قسم کی ذہنی پریشانی سے چھٹکارا حاصل کیے بغیر نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لندن میں اپنا وقت بالکل ضائع نہیں کریں گے۔ یاد رکھیے ہر گزرا ہوا لمحہ ہی انسان کا اصل نامۂ اعمال ہوتا ہے۔ اگر یہ لمحہ بے کار گزرا ہے تو نامۂ اعمال پر ایک سیاہ نقطے کا اضافہ ہو جائے گا۔

میں ایک اور معاملے میں بھی آپ کو مشورہ دوں گا۔ دوست بنانے کے سلسلے میں آپ قدرے غیر محتاط ہیں۔ دوستی کی بنیاد ہمیشہ فکری و ذہنی ہونی چاہیے۔ محض وقت گزاری کے لیے دوستی کے دامن کو وسیع کرنا زندگی کے دامن کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ اب تک آپ ہر اس شخص کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے رہے ہیں جو آپ کے ساتھ چند لمحے گزار سکے، اسی لیے آپ کو ایسے لوگ ملتے رہے جو مخلص نہیں تھے۔ لندن میں آپ اس روش کو ترک کر دیجیے گا۔ کسی کو دوست بنانے یا سمجھنے سے پہلے یہ دیکھ لیجیے گا کہ وہ ذہنی سطح پر دوستی نبھا سکتا ہے یا نہیں۔ معاف کیجیے گا کہ میں اکثر ناصح مشفق بن جاتا ہوں لیکن کیا کروں، میں آپ کا بہی خواہ ہوں اور میری دلی خواہش ہے کہ آپ زندگی میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیں اور اس طرح زندگی نہ گزاریں جس طرح عام لوگ گزارتے ہیں۔

کالم نویسی کا شغل جاری ہے لیکن اب میں اس سے گھبرا گیا ہوں، کیونکہ اس میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ اب تک کے کالم آپ کو بھجوانے کی کوشش کروں گا۔[1]

سفرنامے کی کاپیاں جوڑی جا رہی ہیں۔ یہ کام ان شاء اللہ اس مہینے کے آخر تک مکمل ہو جائے گا۔ پھر طباعت و جلد سازی کا مرحلہ ہے جو بہت جلد طے ہو گا۔ اس سلسلے میں جو تاخیر ہوئی، مجھے اس کا افسوس ہے لیکن موجودہ حالات میں یہ تاخیر ناگزیر تھی۔[2]

مولانا مہر کے سلسلے میں کام جاری رکھیے۔ جس قدر جلد ممکن ہو مسودہ بھیج دیجیے تاکہ میں اس کام کو آگے بڑھا سکوں۔

انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں جانے کا اتفاق ہوا یا نہیں؟ آپ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہر ہفتے پابندی سے خط لکھتے رہیے۔ اپنے تجربات و مشاہدات کو تفصیل سے قلم بند کیجیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۱/۸ اکتوبر ۱۹۷۷ء

﴿۲﴾

برادر مکرم و محترم۔ سلام مسنون!

گرامی نامہ مورخہ ۶ رنومبر ابھی ابھی ملا ہے۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ میں نے ۳۰ اکتوبر کو ایک عریضہ ارسال کیا تھا، امید ہے وہ اب تک مل چکا ہو گا۔[3]

آپ نے اپنے گرامی نامے میں شکایت کی ہے کہ میں خط کا جواب نہیں دیتا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ کو خط لکھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں ان خوش گوار لمحوں کو یاد کرتا ہوں، بلکہ ان میں پھر کھو جاتا ہوں جو آپ کے ساتھ گزرے تھے۔ اس صورت حال کی ساری ذمہ داری ڈاک پر ہے۔ ادھر سے میں خط لکھتا ہوں، وہ ابھی آپ تک پہنچتا نہیں ہے کہ آپ مجھے خط لکھ دیتے ہیں۔ اس خرابی کا حل میں نے یہ تلاش کیا ہے کہ آئندہ میں آپ کو ہر مہینہ کی ۱۵/۵ اور ۲۵ کو خط لکھا کروں گا۔ یہ سوچے بغیر کہ آپ کے خط کا جواب واجب ہے یا نہیں۔ ان تین تاریخوں میں لازماً خط لکھوں گا لیکن آپ پابند نہیں ہوں گے۔ آپ زیادہ سے زیادہ اور طویل سے طویل خط لکھتے رہیے۔ اب تک جو خط آپ نے لکھے ہیں، وہ نہایت مختصر ہیں۔ نیز ان میں دل چسپ باتیں نہیں ہیں جو میں سننے کا متمنی ہوں۔

پچھلے تین دن آپ کی کتابوں کی صفائی میں صرف ہوئے۔[4] ایک آدمی بھی بلا لیا تھا۔ افسوس کہ بیشتر کتابوں کو کیڑا لگا ہوا ہے اور بعض کو تو بے حد نقصان پہنچا ہے۔ ان کی وجہ سے میری کتابیں بھی متاثر ہوئی ہیں۔ آپ کی متعدد کتابوں کی جلدیں الگ کرنی پڑی ہیں۔ ان کتابوں کا یہ حال ہے تو ان کی حالت کیا ہو گی جو آپ کے گھر پر ہیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ اپنے گھر والوں کو ہدایت کر دیں کہ وہ کتابوں کی صفائی باقاعدگی سے کرتے رہیں۔ کراچی کی ہوا کتابوں کے لیے بہت ناسازگار ہے۔ اگر کتابیں بغیر استعمال کے یا بغیر صفائی کے پڑی رہیں تو کیڑوں کی غذا بن جاتی ہیں۔ بہر حال مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے، کر رہا ہوں۔

آپ کی کتاب کی کاپیاں جوڑی جا چکی ہیں۔ اب چند روز ان کی چیکنگ میں صرف ہوں گے۔ اس کے بعد یہ پریس بھیج دی جائیں گی۔ میں اس سلسلے میں حتی الامکان عجلت سے کام لے رہا ہوں لیکن کام اتنا زیادہ ہے کہ وقت صرف ہو رہا ہے۔ بہر حال آپ مطمئن رہیں۔ دیر آید درست آید والا معاملہ ہے۔

میں آپ کے ارشاد کے مطابق ''سفرنامہ اقبال''[5] کے چند نسخے بحری ڈاک سے بھیج چکا ہوں۔ یہ آپ کو ملیں تو اطلاع دیجیے گا۔ میرے پچھلے خط میں بہت سی باتیں جواب طلب تھیں۔ توجہ فرمائیے۔

کالم ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے، مگر اب اس میں دل نہیں لگ رہا کیونکہ میرے دوسرے کام متاثر ہوئے ہیں۔ سوچا ہے کہ دسمبر کے آخر تک لکھوں گا، پھر معذرت کرلوں گا۔

یہ خط رجسٹری سے بھیج رہا ہوں تاکہ آپ کو لازماً مل جائے۔ باقی باتیں پھر کروں گا۔ ورنہ ڈاک کا وقت نکل جائے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۱۵ر نومبر ۱۹۷۷ء

﴿۳﴾

برادر عزیز و مکرم و محترم۔ سلام مسنون:۔

گرامی نامہ ملا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ آپ کی علمی مصروفیات کا احوال پڑھ کر دلی مسرت ہوئی ہے۔ خدا آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔ اب کے خط لکھنے میں مجھے تاخیر ہوگئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میں نے عہد کیا تھا کہ جب تک آپ کا سفرنامہ پریس نہ چلا جائے میں خط نہیں لکھوں گا۔ لہٰذا میں نے دن رات ایک کر کے سارا کام مکمل کرلیا، اب یہ پریس میں ہے اور ان شاء اللہ چند روز میں چھپ جائے گا۔ طباعت کے بعد ڈمی بنوا کر ٹائٹل کا ڈیزائن بنواؤں گا کیونکہ پہلے جو ڈیزائن بنوایا وہ دوسرے سائز کا تھا۔ کچھ دن جلد سازی میں لگیں گے۔

یہ سفرنامہ ۳۲۸ صفحات میں مکمل ہوا ہے۔ انتساب میں نے ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نام کیا ہے تاکہ ان کو یاد کرنے کی صورت نکل آئے۔ دیباچہ میں نے بہت مختصر کردیا ہے۔ خصوصاً آخری حصہ۔ قطع و برید فرنگ سے متعلق حذف کردیا ہے۔ اس کے باوجود یہ دس صفحات میں آیا ہے۔ وہ تمام صفحات دوبارہ لکھوا دیے جن کی کتابت آپ کو پسند نہیں آئی تھی۔ چھپنے پر ایک کاپی فوراً ہوائی ڈاک سے بھیج دوں گا اور باقی بحری جہاز سے۔ مطلع فرمایئے کہ آپ کو کتنی کاپیوں کی ضرورت ہوگی؟

یہاں پچھلے دنوں علامہ اقبال کے صد سالہ یوم پیدائش کی بڑی دھوم رہی۔ اہل علم و ادب کا ہجوم لاہور میں تھا۔ کچھ لوگ کراچی بھی آئے۔ مثلاً علی سردار جعفری، آل احمد سرور، صباح الدین عبدالرحمٰن۔ والد صاحب مرحوم قبلہ اکثر آپ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ وہ بھی اقبال کانگرس کے سلسلے میں لاہور گئے تھے اور وہاں انھوں نے ایک مقالہ بھی پڑھا تھا۔

آپ کے ڈاکٹر چچا جان مرحوم کے انتقال کا بہت افسوس ہوا۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

آپ نے اب تک کن پاکستانیوں سے ملاقات کی؟ کیا کبھی ابن انشا سے ملاقات ہوئی؟

آج دسمبر کی ۲۷ تاریخ ہے۔ سردی آنے کا نام ہی نہیں لیتی اور دوپہر کو تو پنکھا چلائے بغیر گزارا ہی نہیں ہوتا۔

میں حسب معمول اپنے کاموں میں مصروف ہوں۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۲۷ دسمبر ۱۹۷۷ء

﴿۴﴾

یار مہربان۔ تسلیمات

ڈاک کا نظام اتنا خراب ہے کہ میرے خط آپ کو دیر سے ملتے ہیں یا ملتے ہی نہیں اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں خط نہیں لکھتا۔ حالانکہ سب کام چھوڑ کر آپ کو خط لکھتا ہوں۔ ایک مرتبہ احتیاطاً آپ کو رجسٹری سے خط لکھا وہ آپ کو ڈیڑھ مہینے بعد ملا۔ ڈاک کے نظام میں جو معشوقانہ خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان کی وضاحت کے لیے ایک دستاویزی ثبوت بھیج رہا ہوں۔ اس خط کے ساتھ آپ ایک تراشا ملاحظہ کریں گے۔ یہ آپ کے ایک لفافے کا ہے۔ آپ نے ۱۶ر اکتوبر ۷۷ء کو جو خط لکھا تھا، وہ مجھے جنوری کے مہینے میں ملا ہے۔ اس تراشے پر دو مہریں ہیں۔ ایک لندن کی ۱۷ر اکتوبر ۷۷ء کی اور دوسری کراچی ۱۰ جنوری ۷۸ء کی۔ کراچی کی مہر پر ۱۰ر اور ۷۸ء واضح ہیں۔ جنوری کا لفظ نظر نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ جنوری کے بعد کا مہینہ نہیں ہوسکتا۔ یہ ثبوت اس لیے پیش کیا ہے تاکہ آپ کو یقین آسکے کہ ڈاک کے نظام میں ہمارے سیاسی نظام سے زیادہ گڑبڑ ہے۔ آپ یہ خیال کبھی دل میں نہ لائیں کہ میں آپ کے معاملے میں کوتاہی قلم سے کام لوں گا۔ جب میں آپ کے ساتھ گھنٹوں باتوں میں مصروف رہ سکتا ہوں تو کیا خط لکھنے کے لیے چند منٹ نہیں نکال سکتا اور پھر یہ تو میرا اخلاقی فرض بھی ہے۔ ایک دوست جو ہزاروں میل دور خود عائد کردہ قید تنہائی کاٹ رہا ہو اس کی مزاج پرسی میں نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔

سفرنامے کا قصہ یہ ہے کہ خدا خدا کر کے چھپ گیا ہے۔ آج کل نصابی کتابوں کی طباعت کا زور ہے۔ اول تو کوئی پریس کتاب لینے پر تیار نہیں ہوا تھا۔ ایک راضی ہوا اور پندرہ دن کے وعدے پر لیکن اس نے پورا مہینہ لگا دیا۔ کل ہی طباعت مکمل ہوئی ہے اور کتاب جلد ساز کے یہاں پہنچ گئی ہے۔ ٹائٹل کا بلاک بنوالیا ہے۔ جلد ساز چند روز میں ڈمی کاپی دے گا اور اس کے مطابق ٹائٹل چھپ جائے گا۔ اس دوران میں جلد سازی بھی مکمل ہو جائے گی اور اس طرح میں ایک فرض سے سبک دوش ہو جاؤں گا۔ ایک کاپی آپ کو فوراً ہوائی ڈاک سے بھیج دوں گا اور باقی سمندری ڈاک سے۔ ہوائی ڈاک سے زیادہ کاپیاں اس لیے نہ بھیجوں گا کہ ایک کاپی پر ڈاک کا خرچ تقریباً پچیس روپے آتا ہے۔

ان شاء اللہ کتاب چھپتے ہی اس پر تبصرے بھی کروا دوں گا۔ آپ پردیس میں ہوں گے اور آپ کی دھوم یہاں ہوگی۔ اس کام پر جو وقت صرف ہوا ہے وہ میرے اندازے سے بہت زیادہ ہے۔ بہرحال آپ کی خوشی مقصود تھی اس لیے میں نے پوری دل جمعی کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے۔ اب سوچ رہا ہوں کہ مولانا مہر والا کام بھی منظر عام پر آجائے تو بہت اچھا ہو۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟ آپ نے کہا تھا کہ آپ لندن میں اس موضوع پر کام کریں گے۔ کیا آپ اب بھی اپنے ارادے پر قائم ہیں یا میں ہی موجودہ مسودے کی نظر ثانی کر ڈالوں؟

آپ نے اپنے گرامی نامے مورخہ ۱۷ر اکتوبر میں ایک سفرنامے کا ذکر کیا ہے جو لاہور کے ایک شخص نے تبت کی سیاحت کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کتاب کی مجھے شدید ضرورت ہے۔ اگر آپ اپنی پہلی فرصت میں بھجوا سکیں تو کرم ہوگا۔ اگر یہ کتاب دستیاب نہ ہو تو کم از کم اس کے اردو متن کا فوٹو اور سرورق کی نقل بھجوا دیجیے۔ مگر بہت جلد۔

میرا ایک یہ کام بھی کیجیے کہ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم والوں سے معلوم کیجیے کہ اگر کسی مخطوطے کا فوٹو منگوایا جائے تو کیا

خرچ ہوگا، نیز مائیکرو فلم پر کیا لاگت آئے گی۔

ابن انشا کا انتقال میرے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ ۲۸ برس کے تعلقات تھے۔ یہ شخص طرح دار یہاں سے ہنستا بولتا گیا تھا اور وہاں سے لکڑی کے صندوق میں بند ''کارگو'' کی صورت میں آیا۔ خدا مغفرت کرے۔ بہت اچھا آدمی تھا۔

ایک اور سانحہ بھی ہوا کہ پروفیسر محمد حسن عسکری کا انتقال ہوگیا۔ بڑے ادیب ہی نہیں بڑے آدمی بھی تھے۔ اسلامیہ کالج میں یہ میرے استاد تھے۔ گو میں نے ان کی کلاس میں کبھی شرکت نہیں کی لیکن ان کی تحریروں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ تین برس تک روزانہ ان سے سلام دعا ہوتی تھی۔

آپ اکثر یاد آتے ہیں۔ جب کبھی شام کے وقت میں اداس ہوتا ہوں تو آپ کا خیال ذہن میں آجاتا ہے۔ آپ کے دل کش قہقہے فضا میں گونجنے لگتے ہیں۔ ۱۹/دسمبر کو خاص طور پر بہت یاد آئے۔ ۷۶ء میں یہ پورا دن آپ کے ساتھ گزارا تھا۔ یہ دن اس لیے بھی یاد رہا کہ یہ میرا یوم پیدائش تھا۔

میرا کالم نویسی کا سلسلہ جاری ہے البتہ یہ تبدیلی عمل میں آئی ہے کہ اب ہفتے میں صرف ایک بار لکھتا ہوں۔ اس سے زیادہ لکھنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔

9.....

اقبال کے صد سالہ یوم پیدائش پر یہاں بہت کچھ ہوا مگر کوئی کام کی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ یار لوگوں نے محض روپیہ کمانے کی خاطر پرانی شراب نئی بوتلوں میں پیش کر دی ہے۔

آپ کے چچا جان کے انتقال کی خبر سن کر بے حد افسوس ہوا۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

سفرنامے کی طباعت پر اخراجات اندازے سے کہیں زیادہ آئے ہیں۔ کاغذ تو خیر پہلے کا موجود تھا، صرف طباعت، جلد سازی اور ٹائٹل وغیرہ پر سات ہزار ساٹھ گئے لیکن مجھے اس کا خیال نہیں۔ آپ کی خوش نودی کی خاطر مجھے سب کچھ منظور ہے۔

میں سوچ رہا ہوں کہ اگر کوئی ناشر مل جائے تو سفرنامہ اقبال [1] کا دوسرا ایڈیشن چھپوا دیا جائے۔ آپ کو اگر فرصت ملے تو اس پر نظر ثانی کر ڈالیے۔ آپ اپنے خطوط میں ذرا تفصیل سے کام لیا کیجیے جس جس سے ملاقات ہوا کرے اس کا ذکر کیا کیجیے۔ ذرا یہ بتائیے کن کن نئے دوستوں سے دوستی ہوئی ہے۔ ہر ایک (کا) مفصل تعارف کرایئے۔ کیا کبھی رالف رسل سے ملاقات ہوئی ہے؟ اگر ہو تو میرا اسلام کہیے گا اور ان سے یہ بھی کہیے گا کہ مولوی عبدالحق سے اپنی ملاقاتوں کی روداد لکھ دیں، یا پھر آپ ان سے پوچھ کر یہ روداد قلم بند کر لیجیے گا۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے اعزازی لائبریرین Simon Digby ہیں۔ بڑے دل چسپ آدمی ہیں۔ ۷۱ء میں پاکستان آئے تھے تو ان سے میری ملاقاتیں رہی تھیں۔ ان سے آپ ضرور ملیے۔ میرا اسلام کہیے گا۔

پاکستانیوں میں سے کس کس سے ملاقات ہوئی ہے؟ اگر آپ کو فرصت ملے تو ایک مضمون لکھیے ''ابن انشا کے آخری ایام''۔ اس سلسلے میں پاکستانی سفارت خانے اور بی بی سی والوں سے آپ کو بہت مدد مل سکتی ہے۔

دیکھیے میں نے کتنا طویل خط لکھ ڈالا۔ اس وقت میں یہی تصور کر رہا ہوں کہ آپ میرے سامنے بیٹھے ہیں اور میں باتیں کر رہا ہوں۔

ابھی کچھ دیر پہلے والد صاحب قبلہ سے مل کر آرہا ہوں۔ آپ کا سلام انھیں پہنچا دیا ہے۔ وہ دعا کہہ رہے ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۲۸ جنوری ۱۹۷۸ء

اور ہاں اگر کوئی ''خاص'' آدمی دوست بنا ہو تو اس کا حال لکھیے اور ہو سکے تو اس کی تصویر بھی بھیجیے تاکہ آپ کے ذوق نظر کی داد دے سکوں۔

﴿۵﴾

۳۔ڈی ۹/۲۶

ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

برادر مکرم و محترم۔ سلام مسنون:۔

آپ کے دو خط ایک ساتھ ملے۔ ان میں سے ایک محبت نامہ تھا اور دوسرا قیامت نامہ۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے پہلے محبت نامہ کھول لیا ورنہ کہیں دوسرا لفافہ پہلے کھول لیتا تو پھر پہلا لفافہ کھولنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ بندہ پرور! اس بندۂ ناچیز پر ایسا بھی کیا ظلم۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کے خط کا جواب نہ لکھوں۔ میں تو سارے کام چھوڑ کر آپ کو خط لکھتا ہوں۔ اگر آپ پردیس میں ہیں تو میری حالت آپ سے زیادہ قابل رحم ہے کہ میں وطن میں غریب الوطن ہوں۔ جہاں کوئی ہم سخن اور ہم زبان نہ ہو، وہاں آدمی غریب الوطن ہی ہوتا ہے۔ میری وطنیت آپ کے دم سے تھی۔ آپ میرے ہم سخن تھے، ہم زبان تھے۔ آپ کے سوا کسی سے میل جول نہ تھا۔ اب آپ کو خط لکھتا ہوں تو یہ تصور کر لیتا ہوں کہ آپ سامنے بیٹھے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر اگر کبھی میرے خط نہ ملے تو سمجھ لیجیے کہ خطا میری نہیں ڈاک والوں کی ہے۔ ہائے اگلے زمانے میں کیا عمدہ ڈاک کا نظام تھا، ہر منزل پر تازہ دم گھوڑے کھڑے رہتے تھے۔ پچھلی منزل کا ہرکارہ اگلی منزل کے ہرکارے کو خطوں کا پشارہ تھما دیتا اور اس طرح خط ایک منزل سے دوسری منزل تک ہوتا ہوا منزل آخر تک پہنچ جاتا تھا۔ نہ ٹکٹ لگانے کا اور نہ ٹکٹ پر مہر لگوانے کا کھڑاگ، نہ خط گم ہو جانے کا خطرہ۔ اب یہ حال ہے کہ دس روپے رکشے کے آنے جانے کے صرف کرو، تین روپے کا ٹکٹ لگاؤ اور پھر بھی یقین نہیں ہوتا کہ خط مکتوب الیہ تک ضرور پہنچے گا۔

آپ کا قیامت نامہ یعنی خفگی نامہ پڑھ کر دل کانپ اٹھا۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے ہاں خفگی کا کم سے کم اظہار طلاق و عاق سے ہوتا ہے۔ گو آپ مجھے طلاق دے سکتے ہیں نہ عاق کر سکتے ہیں لیکن یہ تو لکھ سکتے ہیں:

''میں یہاں کے علمی حلقوں میں آپ کی دوستی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہوں اور ادھر آپ نے خطوں کا جواب نہ دینے کی قسم کھا رکھی ہے''۔

میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ کے غصے میں بھی محبت کا رنگ ہوتا ہے لیکن مزا تو جب تھا کہ آپ پری وشوں کے حلقے میں بھی میرا ڈھنڈورا پیٹتے۔ بہر حال آپ وعدہ کیجیے کہ میرا خط نہ ملنے کی صورت میں آپ یہ ہرگز تصور نہیں کریں گے کہ میں کوتاہی

قلم کا مرتکب ہو رہا ہوں۔

اچھا اب دوسری باتیں سنیے:

آپ کا سفرنامہ ابھی تک جلد ساز کی تحویل میں ہے۔ اس نے حتمی وعدہ ۲۰ فروری کا کیا ہے۔ ٹائیٹل بھی چھپ رہا ہے۔ چار رنگوں کا ہے۔ اس کے لیے بہترین قسم کا آرٹ پیپر خرید کر پریس پہنچایا جا چکا ہے۔ کتاب ہر حالت میں آئندہ ہفتے تک مکمل ہو جائے گی۔ میں اس کے چھ نسخے اجمل صاحب کو بھیج دوں گا۔ ایک ان کے لیے اور پانچ آپ کے لیے۔ یہ کہوں گا کہ پانچوں نسخے ہوائی ڈاک سے آپ کو بھیج دیے جائیں۔ مزید نسخوں کی ضرورت ہو تو لکھیے گا۔

معین الدین عقیل صاحب اور کشفی صاحبان کی کتابوں کا ایک ایک نسخہ اجمل صاحب کو پہنچا دیا ہے۔ امید ہے یہ دونوں کتابیں جلد ہی آپ کو مل جائیں گی[11]۔ اب ذرا فرصت ملے گی تو مولانا مہر سے متعلق آپ کی کتاب کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کروں گا۔

میں نے اس مہینے سے کالم نگاری چھوڑ دی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کام میں ذہنی طور پر اس قدر مصروفیت رہتی ہے کہ دوسرا کوئی کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام کی خاطر میں اپنے اصل کاموں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اگرچہ اخبار والوں کا بے حد اصرار ہے کہ میں یہ سلسلہ جاری رکھوں لیکن میرے لیے ممکن نہیں۔

صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ۷ فروری کو یہاں سے واپس اپنے وطن چلے گئے۔ ۴ اور ۶ فروری کو ان سے دو طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ ان کے گھر پر اور دوسری مرتبہ پیر راشدی صاحب کے مکان پر۔ دونوں مرتبہ آپ بہت یاد آئے۔ گفتگو کچھ اتنی زیادہ علمی تھی کہ بار ہا آپ کے اخلاقی و غیر اخلاقی سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

۱۰ فروری کو ڈاکٹر معین الدین عقیل کی شادی تھی۔ سہرا باندھ کر وہ ایسے نادم نظر آ رہے تھے کہ جیسے دولہا نہ ہوں نادم سیتا پوری ہوں۔ پھر ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ خدا جانے ان پر یا فریق ثانی پر یا دونوں پر کیا گزری۔ ڈاکٹر عقیل کی شادی میں نہ جانے پنجابی کی وہ رباعی یاد آتی رہی جس کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے زمانے کے صوفی جب نعرہ مارتے تھے تو سننے والے بے ہوش ہو جاتے تھے۔ آج کل کے صوفی خود ہی نعرہ مارتے ہیں اور خود ہی بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب سے ایک دن غالب لائبریری میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کا ذکر خیر رہا۔ کہنے لگے جانے سے پہلے ایک دن آئے تھے اور مجھے عزیز بھٹی پارک لے گئے تھے۔ وہ بھی میری طرح آپ کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ ان کا پتا یہ ہے:

4A-6/13 ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

آپ فی الحال اتنا تو کر سکتے ہیں کہ سفرنامہ اقبال کی کتابت کی غلطیوں کی نشان دہی کر دیں اور ہاں آپ شاید یہ چاہتے تھے کہ فلسطین[12] سے متعلق جو مضمون آپ نے لکھا تھا، وہ بھی اس میں شامل ہوگا۔ یہ باتیں میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اگر کبھی جی میں آیا تو اس کتاب کو دوبارہ چھپوانے کی کوشش کروں گا۔

رالف رسل صاحب سے میرا سلام کہیے گا[13]۔ وہ کراچی آئے تھے تو ان سے ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ وہ از راہ کرم انجمن تشریف لائے تھے۔ بابائے اردو سے متعلق ان کی گفتگو ضرور ''توار بند'' کر لیجیے۔ آپ نے ''ٹیپ بند'' لکھا ہے۔ ایران میں اس کے لیے ''توار بند'' کی اصطلاح رائج ہے۔ توار وہی لفظ ہے جو پنجابی میں ''نواڑ'' کہلاتا ہے۔ وہ سفید پٹی جس سے پلنگ کا متن بنا جاتا ہے۔ (دیکھیے لفظ متن کا یہ کتنا عمدہ استعمال ہے)

آپ کے موضوع سے متعلق ایک کتاب ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے بھی لکھی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ یہاں نہیں ملتی، ورنہ یہ بھی اجمل صاحب کو بھجوا دیتا۔ اس کا نام ہے ''اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر'' یہ برٹش میوزیم میں ضرور ہوگی۔ آپ وہاں محمود صاحب سے ملیے۔ وہ ضرور آپ کی مدد کریں گے۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔[14]

ایس ایم شاہ[15] صاحب سے میرا سلام بھی کہہ دیجیے۔ انھوں نے ایک کتاب کا عکس بھجوانے کا وعدہ کیا تھا۔ دو تین سال سے یہ وعدہ وہ نبھائے چلے جا رہے تھے، اب یہ کتاب مجھے مل گئی ہے۔ انھوں نے خود تو وعدہ پورا نہیں کیا لیکن ان کی دعاؤں کے طفیل میرا کام ہو گیا۔ ان کا پی ایچ ڈی کا کام کس مرحلے پر ہے؟ لاہور کے ایک شخص نے تبت کا جو سفرنامہ لکھا تھا، وہ اپنی اولیں فرصت میں بھجوا دیجیے۔ اگر کتاب دستیاب نہ ہو تو اس کا فوٹو اسٹیٹ بھجوا دیجیے بلکہ یہی صورت بہتر ہوگی کیونکہ فوٹو اسٹیٹ سستا ہوتا ہے اور لندن میں تو اور بھی سستا پڑے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں یہ سفرنامہ بھیجنے کی کوشش کریں گے۔ ریڈیو کے کام کے لیے اس کی ضرورت ہے۔

آپ کے بھیجے ہوئے چند خوب صورت تصویری کارڈ مل گئے۔ مگر میں آپ کے کیمرے کی کھینچی ہوئی تصویریں دیکھنے کا مشتاق ہوں۔

والد صاحب قبلہ خیریت سے ہیں۔ آپ کا سلام انھیں پہنچا دیا تھا، وہ دعا لکھواتے ہیں۔

جب کبھی سوسائٹی جاتے ہوئے شہید ملت روڈ سے گزرتا ہوں اور مل پارک کی طرف جانے والی سڑک پر نظر پڑتی ہے تو بے اختیار آپ یاد آ جاتے ہیں۔ ایک روز گلشن اقبال جاتے ہوئے سبزی منڈی کے پاس سے گزرا تو بھی آپ یاد آ گئے۔ اس شہر کے کئی راستوں پر آپ کی یادیں بچھی ہوئی ہیں۔ آپ اکثر یاد آتے ہیں اور میں یہ سوچ کر اداس ہو جاتا ہوں کہ آپ مجھ سے ہزاروں میل دور بیٹھے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ اطمینان بھی رہتا ہے کہ آپ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے وہاں گئے ہیں۔

آپ کا دوسرا سفرنامہ[16] کس مرحلے میں ہے۔ اس کو بھی لکھ ڈالیے، ورنہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا بہت سی تفصیلات ذہن میں محو ہوتی جائیں گی۔

اچھا اب اجازت دیجیے۔ شام کے چھ بج رہے ہیں۔ اس خط کو پوسٹ کرنے کے لیے میٹروپول ہوٹل کے ڈاک خانے جاؤں گا۔ دیکھیے اس ڈاک خانے کے نام پر بھی آپ یاد آ گئے۔ ڈاک خانے کے ساتھ ہی وہ ہوٹل شالیمار تھا جہاں ہم گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۱۵ فروری ۷۸ء

﴿۶﴾

برادر محترم و مکرم۔ سلام مسنون:۔

گرامی نامہ ملا۔ شکریہ۔ اس سے پہلے آپ کو دو خط لکھ چکا ہوں۔ امید ہے وہ آپ کو ملے ہوں گے۔ لاہوری سیاح کا سفر نامہ بھجوانے کا شکریہ۔

خدا خدا کر کے آپ کی کتاب کی طباعت مکمل ہوگئی۔ اس کے چھ نسخے اجمل صاحب کو بھجوا دیے ہیں۔ ایک ان کے لیے اور پانچ آپ کے لیے۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ ایک نسخہ ہوائی ڈاک سے بھیج دیں۔ بتایئے آپ کو اور کتنے نسخوں کی ضرورت ہو گی؟ اس کتاب کی طباعت کے سلسلے میں جو پریشانی ہوئی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ کاتب، پریس، جلد ساز سبھی نے پریشان کیا۔ ان کے جھوٹے وعدوں کی وجہ سے بہت وقت ضائع ہوا۔ آمد و رفت کی دقتوں کے باوجود کم از کم پچاس مرتبہ شہر جانا پڑا۔ اب بہرحال ان تمام پریشانیوں کے مقابلے پر وہ خوشی زیادہ ہے جو اس کتاب کی طباعت سے حاصل ہوئی ہے۔ اجمل صاحب کو پچھلے دنوں ڈاکٹر کشفی اور عقیل صاحب کی کتابیں دی تھیں۔ وہ ان کی قیمت ادا کرنے پر مصر تھے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ یہ میری طرف سے تحفہ ہیں۔ آیندہ بھی آپ کو جس کتاب کی ضرورت ہوگی بھجوا دوں گا۔ کوشش کر رہا ہوں کہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی کتاب بھی مل جائے تو بھیج دوں۔

اب اس کتاب پر تبصرے کرانے کا مرحلہ شروع ہوگا۔

یہ خط ڈاک خانے سے لکھ رہا ہوں اس لیے تھوڑا لکھے کو بہت جانیے۔ اجازت دیجیے۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص
مشفق خواجہ
۲۸ فروری ۷۸ء

بخدمت گرامی
جناب حمزہ فاروقی صاحب

﴿۷﴾

برادر مکرم و محترم۔ سلام مسنون

کل آپ کا ۱۷ر فروری کا خط ملا تھا اور آج ۲۲ فروری کا۔ اس سے پہلے میں تین خط لکھ چکا ہوں جو ۱۰ر ۱۵ اور ۲۸ فروری کو لکھے گئے تھے۔ خیال ہے کہ میرے خط اب تک آپ کو مل چکے ہوں گے۔

آپ کا ۲۲ر فروری کا خط پڑھ کر مجھے دکھ ہوا کہ اگر اس خط کو لکھنے کے بعد آپ دوبارہ پڑھتے تو شاید آپ اسے پوسٹ نہ کرتے۔ آپ ہی انصاف کیجیے کہ ایک خط آپ ۱۷ کو پوسٹ کرتے ہیں اور صرف چار دن کے بعد آپ ۲۲ فروری کو دوسرا خط لکھ دیتے ہیں کہ میرے خط کا جواب نہیں آیا۔ چار دن تو آپ کا خط مجھ تک پہنچنے کے لیے بھی ناکافی ہیں۔ پھر بھلا میرا جواب آپ کو کیسے مل سکتا ہے؟

بہرحال آپ کچھ کریں۔ ترک مراسلت کریں یا ترک مراسم۔ اپنا کام تو محبت کرنا اور کیے جانا ہے۔ میں اس حمزہ فاروقی کو کبھی نہیں بھول سکتا جس کے ساتھ میرا بہت سا وقت گزرا ہے۔

آپ کی کتاب کی طباعت مکمل ہو چکی ہے۔ چھ نسخے اجمل صاحب کو بھجوا دیے ہیں۔ ان میں سے پانچ وہ آپ کو بھیج دیں گے۔ مزید نسخوں کی ضرورت ہو تو وہ بھی بھیج دوں گا۔ میرا خیال تھا کہ اس موقع پر آپ کی طرف سے جو خط آئے گا اسے پڑھ کر میں خوش ہوں گا لیکن افسوس کہ جو خط آیا ہے، اس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ میں نے خواہ مخواہ آپ کے مصنفی و تالیفی کاموں میں ''ناخواندہ مہمان'' بننے کی کوشش کی۔

بہرحال میری دعا ہے کہ خدا آپ کو خوش رکھے۔ اگر کسی دوست کی دل آزاری سے آپ کو خوشی مل سکتی ہے تو خدا اس کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا فرمائے۔

مجھے معلوم نہیں کہ آپ آیندہ خط لکھیں گے یا نہیں، لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی جو محبت ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ میں حسب سابق آپ کی صحت و شادمانی اور ترقی و کامیابی کے لیے دعا گو رہوں گا۔

آپ کا مخلص
مشفق خواجہ
۲ر مارچ ۷۸ء

﴿۸﴾

برادر مکرم و محترم۔ سلام مسنون:۔

گرامی نامہ ملا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ اب آپ مجھ سے خوش ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ اب کسی معاملے میں آپ کا کوئی اعتبار نہیں۔ آپ کا مزاج بھی آسمان کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ کاش آپ کی طبیعت میں زمین کا سا دھیما پن ہوتا جو گردش میں بھی رہتی ہے اور کسی کو اس کی گردش کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا۔ آیندہ کے لیے کانوں کو ہاتھ لگایئے کہ آپ کم از کم ایک آدمی کو یعنی راقم الحروف کو خوش رکھیں گے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آزما کر دیکھ لیجیے۔

خدا کا شکر ہے کتاب آپ کو پسند آئی۔ یہاں بھی اسے پسند کیا گیا ہے۔ دو تین اخباروں میں تبصرے آ چکے ہیں اور اس مہینے میں کئی اور تبصرے آ جائیں گے۔ یہ سب میں آپ کو بھجوا دوں گا۔ میرا دیباچہ بھی لوگوں نے پسند کیا ہے۔ ''آہنگ'' والوں نے تو اسے چھاپ بھی دیا ہے۔ میں نے آپ کی خواہش پر دیباچہ لکھا تھا، آپ کو پسند آیا تو یہی میری محنت کا صلہ ہے۔

کتاب یہاں کے تمام اہم ادیبوں کو بھیجی گئی ہے۔ ہندوستان کے بھی کئی لوگوں کو روانہ کر چکا ہوں۔ اس سلسلے میں لوگوں کے جو تاثرات ہوں گے ان سے بھی آپ کو مطلع کروں گا۔

میں نے اجمل صاحب کو کتاب کے ۲۱ نسخے بھیجے تھے۔ انھیں فون کر دوں گا کہ وہ آپ کو مزید ۱۵ نسخے بھیج دیں۔ انھیں ضرورت ہوگی تو اور دے دوں گا۔ ہاں غالب کا شعر 'گلزار' میں آدھے اسی طرح درست ہے جس طرح کتاب میں چھپا ہے۔ آپ کے مسودے میں غلط تھا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے کتاب کے سلسلے میں دوستوں کو دعوت دی اور اس میں انگریز لڑکیاں بھی شریک ہوئیں۔ یہ لڑکیاں آپ کی دعوتوں ہی میں شریک ہوئی ہیں یا غموں میں بھی شرکت کرتی ہیں۔

میں بھی یہاں آپ کی طرف سے دوستوں کو دعوت دینے کی سوچ رہا ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ لڑکیاں کہاں سے آئیں گی؟ چلیے لڑکیوں اور آپ کے بغیر ہی سہی۔ جب غائبانہ نماز جنازہ ہو سکتی ہے تو غائبانہ دعوت کیوں نہیں ہو سکتی۔

کیا آپ لندن کے کتب فروشوں کی دکانوں پر جاتے ہیں۔ اگر آپ کی عنایت سے کتابوں کی فہرستیں مل جایا کریں تو بہت اچھا ہو۔ کتابیں نہیں تو کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی رہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۶/اپریل ۷۸ء

﴿۹﴾

۲۸/اپریل ۷۸ء

برادر مکرم و محترم۔ سلام مسنون:۔

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۴/اپریل چند روز قبل مل گیا تھا۔ جواب میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ لاہور سے ایک دوست آ گئے تھے۔ وہ میرے ہی مہمان تھے، لہٰذا سارا وقت مہمان نوازی میں گزرا۔ آج صبح وہ روانہ ہوئے تو میں آپ کی خدمت کی حاضر ہو رہا ہوں۔ اس تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ محترم اجمل صاحب سے فون پر بات ہوئی تھی۔ مولانا مہر سے متعلق تمام کاغذات میں انھیں بھیج دوں گا۔ اور وہ ان کا فوٹو اسٹیٹ بنوا کر آپ کو ارسال کر دیں گے۔ انھوں نے کتاب کے مزید دس نسخے طلب فرمائے ہیں وہ بھی بھیج دوں گا۔ کتاب پر تبصرے اب تک تین آئے ہیں۔ جنگ، جسارت اور مساوات میں۔ مزید تبصرے عنقریب شائع ہوں گے۔ یہ سب ایک ساتھ بھیج دوں گا۔ ویسے یہ کتاب پاکستان اور ہندوستان کے متعدد اہل قلم کو بھیجی گئی ہے تاکہ ادبی حلقوں میں اس کا تعارف ہو جائے۔ وقار احمد رضوی اور منیر فاروقی کو بھی ایک ایک نسخہ دے دیا ہے، محض آپ کی یاد دلانے کے لیے۔ ڈاکٹر ریاض الحسن سے فون پر آپ کے متعلق گفتگو ہوئی تھی۔ آپ کا ذکر بہت محبت اور شفقت سے کر رہے تھے۔ ان کے لیے بھی ایک نسخہ ایک صاحب کو دے دیا ہے کہ پہنچا دیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا دیباچہ آپ کے دوستوں نے پسند کیا۔ اس کا افسوس ہے کہ مکمل دیباچہ شامل کتاب نہ ہو سکا۔ ایک صفحے کی خاطر ایک پوری کاپی پڑھانی پڑتی۔ اخراجات خواہ مخواہ بڑھتے۔ کل

ناشر نے چھاپ لی ہے۔ مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی کتاب اہل ہندوستان کے لیے بھی مفید ہے۔ وہاں کے علمی حلقوں میں آپ کا نام کسی حد تک پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اب اس کتاب سے مزید تعارف ہو جائے گا۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ غالب کا شعر اسی صورت میں درست ہے جس صورت میں آپ کی کتاب کے ص ۱۲۹ پر چھپا ہے۔ ''قدِ دل کش'' غالب نے نہیں لکھا، یہ آپ کی اختراع ہے۔ دیوانِ غالب دیکھ لیجیے اس میں ''قد دلجو'' ہی ہے۔

آپ کی کتاب کے سلسلے میں جو تقریب ہوئی تھی اس کی تصویریں ضرور بھیجیے ۱۸۔ میں ان تصویروں کو دیکھ کر سمجھوں گا کہ میں بھی حاضر تھا وہاں۔ رالف رسل صاحب کا مشورہ صائب ہے۔ آپ کو مولانا مہر پر کام ضرور کرنا چاہیے۔ وہاں آپ کو ان کی تمام کتابیں مل جائیں گی۔

والد صاحب قبلہ آپ کی خیریت اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔ وہ آپ کو دعا لکھواتے ہیں۔ آپ کا سلام میں باقاعدگی سے ان تک پہنچا دیتا ہوں۔

میں حسب معمول اپنے کاموں میں مصروف ہوں۔ کالم نگاری میں نے چھوڑ دی تھی لیکن ان لوگوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ جن دو مہینوں میں کالم نگاری نہیں کی ان کی تنخواہ بھی زبردستی دے گئے۔ آخر مجبور ہو کر ہفتے میں ایک دن لکھنے کی حامی بھری ہے۔ اب تک تین کالم چھپ چکے ہیں، چوتھا کل چھپے گا۔

آج کل یہاں سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ خدا کرے آپ خوش و خرم اور صحت یاب ہوں۔

ایس ایم شاہ صاحب کی خدمت میں سلام پہنچا دیجیے۔

آپ کی خیریت کا طالب
مشفق خواجہ

﴿۱۰﴾

۳ ڈی ۹/۲۶ ناظم آباد
کراچی ۱۸

برادر مکرم و عزیز۔ سلام مسنون

اب کے تو واقعی مجھ سے بڑی کوتاہی ہوئی۔ کوئی مہینہ بھر سے آپ کو خط نہیں لکھا۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ اول تو کراچی میں قیام کا موقع بہت کم ملا۔ دوسرے جتنے دن بھی کراچی میں رہا دندان شکنی کے عذاب میں مبتلا رہا۔ امید ہے اس صورت حال کے پیش نظر آپ میری کوتاہی کو نظر انداز کر دیں گے۔ آپ کی کتاب پر اب تک متعدد تبصرے آ چکے ہیں۔ جنگ، حریت، پاکستان ٹائمز، جسارت، آہنگ، قومی زبان وغیرہ میں۔ آہنگ اور قومی زبان کے تبصرے ارسال ہیں۔ باقی آئندہ خط کے ساتھ بھیجوں گا۔ نصر اللہ خاں نے ایک کالم میں آپ کا ذکر کیا تھا، وہ بھی ارسال ہے۔ جنگ کا تبصرہ کسی جاہل مطلق نے لکھا تھا اس لیے اس کا ذکر ہی کیا۔

پاکستان ٹائمز میں لاہور کے کسی ناخلف کا تبصرہ تھا۔ یہ شخص لاہور کے سفرنامہ نویسوں کا تابع مہمل معلوم ہوتا ہے۔ اس

لیے اس کا خیال ہے کہ افسانوی انداز کے بغیر سفر نامہ لکھنا بے معنی ہے۔ یہ تبصرہ میں حاصل کر کے بھیجوں گا کیونکہ اخبار مذکور میرے پاس نہیں آتا۔ بہرحال اس قسم کے تبصروں کا کوئی اثر نہیں لینا چاہیے۔ ہمارے ہاں تبصرہ نگار بغیر پڑھے تبصرہ کرتے ہیں اور اپنی علمیت کے اظہار کے لیے مخالفانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ ۱۹

آپ کا عنایت کردہ سفر نامہ تبت مل گیا۔ بہت دیر میں ملا۔ اگر کوئی لندن سے پیدل چل کر آتا تو شاید وہ اس سے پہلے یہاں پہنچ جاتا۔ اس کرم کا بے حد شکریہ۔ اس سلسلے میں ایک زحمت دوں گا کہ ص ۴۰ اور ص ۴۱ کا عکس نہیں ہے۔ ذرا اصل کتاب ملاحظہ کر کے بتایئے کہ کیا سبب ہے۔ اگر غلطی سے عکس نہ بن سکا تو آپ بھجوا دیجیے۔ مزید کرم ہوگا۔ ۲۰

آپ نے لکھا ہے کہ ستمبر میں مقالہ پیش کرنا ہوگا۔ اس کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے؟ کیا پاکستان آنے کا پروگرام ہے؟ ۲۱

سفر نامہ اقبال کے ہندوستانی ایڈیشن کے لیے میں نے ہندوستان کے ایک دوست کو خط لکھ دیا ہے، جونہی آئے گا آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔

کیا مولانا مہر سے متعلق کاغذات آپ کو مل گئے؟ یہاں آج کل سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ پچھلے دنوں میں سندھ گیا تھا، وہاں تو ایسی گرمی تھی کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کیا آپ اپنا روزنامچہ لکھتے ہیں۔ اگر نہ لکھتے ہوں تو اب شروع کر دیجیے۔ یہ بہت ضروری کام ہے۔

میں اپنے چند کالم عنقریب آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔ یہ لفافہ تبصروں کے بوجھ سے بھاری ہو رہا ہے۔ آیندہ لفافے میں کالم ہوں گے۔ ہاں ''آہنگ'' کا تبصرہ مجھے واپس کر دیجیے گا۔ اس کے بعض اقتباسات کسی دوسری جگہ استعمال کروں گا۔ ویسے آپ کی کتاب کی یہاں خاصی شہرت ہوئی ہے لیکن افسوس کہ بکری نہ ہونے کے برابر ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں

بخدمت گرامی جناب حمزہ فاروقی

لندن

آپ کا

مشفق خواجہ

۶ جون ۷۸ء

11

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون۔

ابھی ابھی گرامی نامہ ملا اور میں فوراً خط لکھنے بیٹھ گیا۔ گو اب کے آپ کا آنا، جانے کی تمہید تھا۔ تاہم اس مرتبہ آپ سے جو ملاقاتیں ہوئیں وہ پہلے کی ملاقاتوں کی نسبت کہیں زیادہ متاثر کن تھیں۔ ملاقاتیں زیادہ بھی ہوئیں اور دلچسپ بھی، اور آپ کو قریب سے دیکھنے کے بہتر مواقع ملے۔ آپ میں چند تبدیلیاں بھی آئی ہیں جو خاصی خوشگوار ہیں۔ پہلی تبدیلی تو یہ ہے کہ آپ میں لوگوں کے ساتھ Adjust کرنے کی صفت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ علامہ شاہ جہاں پوری کے ساتھ آپ بہت خلوص سے ملے۔ دوسری خوبی آپ میں یہ پیدا ہوئی ہے کہ آپ کی حس مزاح پہلے سے بہتر ہو گئی ہے اب آپ مزاح پیدا کرنے کے لیے دوسروں کی دل آزاری کا سامان نہیں بنتے۔ پہلے آپ کا انداز قدرے جارحانہ ہوتا تھا۔ اب اس جارحیت کی جگہ دل کش شائستگی نے لے لی ہے۔ تیسری صفت آپ میں یہ پیدا ہوئی ہے کہ علمی معاملات میں آپ پہلے سے زیادہ اعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ اب یہ سب لوگ ڈاکٹر عقیل اور اظہر حقی وغیرہ آپ کی تعریف پہلے سے کہیں زیادہ کر رہے تھے۔ اور اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ سے زیادہ ملاقاتوں کے مواقع نہیں ملے۔ ۲۲

آپ کے ساتھ میرا جو وقت گزرا اسے میں نعمتوں میں شمار کرتا ہوں۔ آپ کے تجربات و مشاہدات میرے علم میں اضافے کا باعث ہوئے البتہ اس کا افسوس رہا کہ میں آپ کی ڈائری سے بھرپور استفادہ نہ کر سکا۔ اس میں قصور آپ کا ہے۔ آپ نے ڈائری ایسے وقت میں دی جبکہ آپ پابہ رکاب تھے اور میرے لیے ممکن نہ تھا کہ اتنے کم وقت میں اس ہفت خواں کو طے کرتا۔

آپ کا شکریہ کہ رالف رسل کو کتاب آپ نے پہنچا دی۔ باقی لوگوں تک بھی پہنچا دیجیے۔ عارف افتخار کو تو پوسٹ کر دیجیے۔ ہاں دو ایک نسخے کسی دکان پر رکھوانا نہ بھولیے گا۔ کیا میں بحری ڈاک سے چند اور نسخے بھیج دوں؟

بوڈلین لائبریری سے شاہ قدرت کے دیوان کی فوٹو اسٹیٹ کی اشد ضرورت ہے۔ یقین کیجیے کہ اس کے بغیر میرا کام رکا ہوا ہے۔ میں تو ہر لمحے ڈاکیے کا منتظر رہتا تھا کہ اب فوٹو اسٹیٹ آئی اور اب آئی۔ آپ ایسا کیجیے کہ انڈیا آفس یا برٹش میوزیم کے لائبریرین سے بات کیجیے۔ وہ ضرور منگوا دیں گے۔ یا پھر آپ انھیں براہ راست خط لکھیے۔ یہ کام انتہائی ضروری ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ اگر یہ فوٹو اسٹیٹ نہ آئی تو میرا کام رکا رہے گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایس ایم شاہ صاحب سے مشورہ کر لیجیے۔ شاید وہ یہ مسئلہ حل کرنے میں مدد کر سکیں۔ ۲۳

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں آپ کی حاضری باعث رشک ہے۔ خدا آپ کو ایسے مواقع مزید عطا فرمائے۔ ۲۴

بھئی وہ فلمیں تو اب کے پھر حسب معمول سادہ اوراق تھیں۔ آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ محنت بھی ضائع ہوئی اور پیسے بھی۔ اب کے میں بھی آپ کے نقش قدم پر چلا۔ یعنی میرے کیمرے کی فلم چلی ہی نہیں۔

ابھی ''جسارت'' میں آپ کی روانگی کی خبر شائع ہوئی ہے۔ انٹرویو ان شاء اللہ ایک آدھ ہفتے بعد شائع ہوگا۔ ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب سے بات ہوئی تھی، ان سے میں نے تبصرہ لکھنے کا تقاضا کیا ہے۔ وہ جلد لکھ کر دیں گے۔

میری کتاب جو لاہور سے چھپ رہی ہے اس کے ساڑھے سات سو صفحات چھپ کر آ چکے ہیں۔ یہ اگلے ماہ تک مکمل ہو جائے گی۔ ۲۵

۲۳ رنومبر کو سعید صاحب کی شادی کی تاریخ طے ہوئی ہے۔ ان کا خط آیا ہے جس میں آپ کی بہت تعریف لکھی ہے اور اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ اس سے پہلے آپ سے زیادہ قریب رہنے کا موقع کیوں نہ ملا۔

کبھی موقع ملے تو میری کتاب پڑھ ڈالیے۔ یہ شاعری کیا ہے وحشت تنہائی کا سفر ہے۔ آپ کے موجودہ حالات میں یہ کتاب آپ کا خوب ساتھ دے گی۔ ۲۶

آپ کے مقالے کا معاملہ کس حد تک آگے بڑھا ہے؟ آپ پریشان نہ ہوں، یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آپ جیسے صاحبان علم تو اپنے علم کی زکوٰۃ دے ڈالیں تو ایسے کئی مقالے تیار ہو سکتے ہیں۔

والد صاحب قبلہ خیریت سے اور آپ کو دعا لکھواتے ہیں۔

خدا کرے آپ خوش وخرم ہوں۔

بخدمت گرامی
جناب محمد حمزہ فاروقی

آپ کا
مشفق خواجہ
۱۷/اکتوبر ۷۸ء

﴿۱۲﴾

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون:۔

ابھی ابھی آپ کے دو خط ایک ساتھ ملے۔ جی خوش ہوا کہ آپ میرا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں دعائے خیر ہی کر سکتا ہوں۔ خدا آپ کو یہاں اور وہاں دونوں جگہ خوش رکھے۔ (یہاں سے مراد پاکستان اور وہاں سے انگلستان)

آپ یاد آتے ہیں اور اکثر یاد آتے ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی طارق نے ''بزلی بی ہوٹل'' کے پیچھے فلیٹ لے لیا ہے، اس لیے اب اکثر اس طرف جانا ہوتا ہے تو ہوٹل پر نظر پڑتے ہی آپ یاد آ جاتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ ہی یادوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ آپ یہاں تھے تو دنیا سے میرا رابطہ قائم تھا اور اب تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ترک دنیا کی منزل کے بعد ترک ترک کے مرحلے سے گزر رہا ہوں۔

آپ کے بارے میں ''جسارت'' میں جو خبر چھپی تھی، اس کا تراشہ بھیج رہا ہوں۔ انٹرویو ابھی نہیں چھپا۔ جلد ہی چھپ جائے گا اور فوراً بھجوا دوں گا۔

سلیم الدین قریشی صاحب سے آپ کی رشتہ داری کی خبر سن کر کم از کم مجھے تو خوشی ہوئی۔ ان صاحب کے مضامین جو کتاب میں چھپتے رہتے ہیں، میری نظر سے گزرے ہیں۔ یہ مفید کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے آپ کو انڈیا آفس کے جو کیٹلاگ دکھائے تھے، ان کے نام اور قیمتیں لکھ بھیجیے پھر فیصلہ کروں گا کہ کون سا خریدنا چاہیے۔

قریشی صاحب سے یہ بھی معلوم کیجیے کہ بلوم ہارٹ کا اردو مخطوطات کا جو کیٹلاگ ۱۹۲۶ء میں چھپا تھا اس کے بعد بھی کوئی کیٹلاگ اردو کا چھپا کہ نہیں۔ اگر نہیں تو کیا کوئی ایسا ذریعہ ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ جن مخطوطات کا حوالہ مذکورہ کیٹلاگ میں نہیں ہے، ان کے نام کیا ہیں؟ کیا ان کی کوئی Hand List موجود ہے؟

حیرت ہے کہ قریشی صاحب نے بوڈلین لائبریری کے ایک مخطوطے کا عکس حاصل کر کے دینے سے معذوری کا اظہار کیا ہے۔ انگلستان کی لائبریریاں تو اس سلسلے میں عام لوگوں سے تعاون کرتی ہیں اور قریشی صاحب تو اس میدان کے خاص الخاص آدمی ہیں۔ بہر حال اس مخطوطے کی وجہ سے میرا کام رکا ہوا ہے۔ اگر ادبی کاموں کے کرنے سے ثواب اور نہ کرنے سے گناہ ہوتا ہے تو میں یہ کہتا کہ آپ میرے کام میں تاخیر کر کے خواہ مخواہ گناہ گار ہو رہے ہیں۔ ہمت کر کے آپ قریشی صاحب کے مشورے سے بوڈلین لائبریری والوں کو ایک خط لکھ بھیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ڈاک سے آپ کو فوٹو اسٹیٹ بھیج دیں گے۔ ۲۷

آپ کی خدمت میں سب سے پہلے یہ کتاب روانہ کروں گا۔

پرسوں مولانا عبدالعزیز میمن کا انتقال ہو گیا۔ یہ علمی دنیا کا بہت بڑا نقصان ہے۔ خدا مغفرت کرے۔

کل غالب لائبریری میں ممتاز حسن مرحوم کی برسی پر ایک جلسہ ہوا۔ آپ بہت یاد آئے۔ ساتھ ہی وہ سب ملاقاتیں بھی یاد آئیں جن میں آپ بھی شریک تھے۔ ممتاز حسن صاحب جیسے لوگ ہمارے معاشرے میں کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ واقعی عظیم انسان تھے۔ میں نے ایسا علم دوست اور انسان دوست انسان دوسرا نہیں دیکھا۔ میری مرتبہ کتاب ''اقبال از احمد دین'' انجمن کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔ اس کا انتساب میں نے ممتاز حسن صاحب ہی کے نام کیا ہے اور کسی کا یہ شعر لکھا ہے:

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزم خیال سے بھی گئے

کل ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے مذکورہ جلسے میں ممتاز حسن مرحوم کے بارے میں ایک مختصر لیکن اچھا مضمون پڑھا تھا۔ جلسے کے بعد آپ کا ذکر کرتے رہے۔ خیریت پوچھتے رہے۔ تبصرے کا وعدہ میں نے یاد دلایا۔ انھوں نے فرمایا کہ جلد ہی لکھ دیں گے۔

سعید صاحب کے نام کا خط انھیں پوسٹ کر دیا ہے۔ باقی سب لوگ خیریت سے ہیں۔ اظہر حقی صاحب آئندہ مہینے میں والد بن جائیں گے۔

کبھی کتابوں کی دکان پر جانا ہو تو دیکھیے گا کہ پیپر بیک میں کسی کی کوئی Autobiography شائع ہوئی ہے یا نہیں۔ مجھے دل چسپی ایسے لوگوں کی خود نوشتوں سے ہے جو ہندوستان سے متعلق رہے ہوں، لیکن یہ فرصت کا کام ہے۔ جب کبھی آپ کو فرصت ہو تو۔

والد صاحب قبلہ خیریت سے ہیں۔ شام کو جاؤں گا اور آپ کا سلام پہنچا دوں گا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ اگر مولانا حسن مثنیٰ صاحب ابھی تک وہاں موجود ہوں تو میرا اسلام کہیے۔ ۲۸

آپ کا مشفق خواجہ
۲۶/اکتوبر ۷۸ء

ضروری:

آپ نے جو تصویریں دی تھیں، وہ اچھی نہیں ہیں۔ ایک اچھی تصویر جو چکنے کاغذ پر ہو، بھیجیے تاکہ تصویر چھپے تو لوگوں پر رعب پڑے۔

﴿۱۳﴾

۲۶/نومبر ۷۸ء

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون۔

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اپنے مقالے کی تدوین میں شب و روز مشغول ہیں۔ آپ کو ایسے ہی

کاموں میں مشغول رہنا چاہیے اور یہی آپ کی زندگی کا مقصد ہے۔

ایک تشویش ناک خبر یہ ہے کہ جناب بشیر احمد ڈار شدید بیمار ہیں۔ تین روز ہوئے ان کے صاحب زادے کا فون آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ دو مہینے سے ڈار صاحب نے لکھنے پڑھنے کا کام چھوڑ رکھا ہے اس لیے کہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ ایکسرے میں پھیپھڑے پر ایک دھبہ سا نظر آیا ہے جس کی بنا پر کینسر یا ٹی بی کا خدشہ ہے۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ ڈار صاحب کا دم غنیمت ہے۔ دعا کیجیے کہ وہ صحت یاب ہو جائیں اور تا دیر سلامت رہ کر علم کی خدمت کریں۔ میں نے جب سے ڈار صاحب کی تشویش ناک حالت کی خبر سنی ہے، طبیعت سخت بے چین ہے۔ آپ ڈار صاحب کو مزاج پرسی کا خط ضرور لکھیے۔ ان کا پتا یہ ہے۔ ۳۳۵ شاد باغ، لاہور

آپ کو جس مخطوطے کے عکس کے لیے کہا تھا، اس کی شدید ضرورت ہے۔ اس کے بغیر میرا کام رکا ہوا ہے۔ جس طرح بھی ہو، اسے حاصل کیجیے۔ آپ نے لکھا ہے کہ نومبر کے آخر تک آپ کے مقالے کا کام ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپ مذکورہ عکس کی فراہمی پر توجہ دیجیے۔ یہ اتنا آسان کام ہے کہ آپ جیسے مستعد اور فعال انسان کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس علمی کام میں تعاون کر کے ثواب حاصل کریں گے اور یہ بھی یاد رہے کہ علمی کاموں میں تاخیر کا سبب بننے کا گناہ ہوتا ہے۔ خدا آپ کو اس گناہ سے محفوظ رکھے۔

آپ کا انٹرویو میں کب کا لکھ کر انھیں دے چکا ہوں۔ مگر اخبار والوں کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ اکثر یاد کراتا رہتا ہوں۔ اب توقع ہے کہ جلد چھپ جائے گا۔ میرا کیمرا خوب کام کر رہا ہے۔ یہ شوق بہت مہنگا ہے اس لیے کم تصویریں اتاری ہیں لیکن بہت اچھی۔

سب لوگ خیریت سے ہیں۔ والد صاحب قبلہ آپ کو سلام لکھواتے ہیں۔ آپ کی بھابی بھی سلام لکھوا رہی ہیں۔

خدا کرے آپ ہر طرح سے خیریت سے ہوں۔

میری کتاب کس کس کو دے دی؟ مولانا حسن مثنیٰ کی خدمت میں سلام پہنچا دیجیے۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۲۶ر نومبر ۷۸ء

﴿۱۴﴾

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ یکم دسمبر آج ہی موصول ہوا ہے۔ اتنی تاخیر شاید محرم کی تعطیلات کی وجہ سے ہوئی ہے، میں بھی گزشتہ ماہ کی آخری تاریخوں میں ایک عریضہ لکھ چکا ہوں، جو امید ہے مل چکا ہوگا۔

خوشی کی بات ہے کہ بوڈلین لائبریری کو جو آپ نے خط لکھا تھا، اس کا جواب آ ہی گیا۔ آپ نے حساب لکھا ہے، وہ میرے ناقص خیال میں درست نہیں ہے۔ خط میں لکھا ہے کہ سلور پرنٹ کا رخ 16P برائے ایک پرنٹ ہے۔ مخطوطے کے جو فولیو

مجھے درکار ہیں ان کی تعداد ۴۸ ہے۔ فولیو دو صفحوں کا ہوتا ہے اور عام طور پر ایک پرنٹ میں دو صفحے آتے ہیں۔ اگر ایک پرنٹ میں ایک ہی صفحہ مانا جائے تو تب بھی اجرت 1536=16x96 پنس ہوتی ہے۔ اب آپ اس کے پونڈ خود ہی بنا لیجیے۔ میرے حساب سے تو کل خرچ کسی طرح بھی سات پونڈ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اگر ایک پرنٹ میں دو صفحے آ گئے تو اجرت ساڑھے تین پونڈ ہو گی۔ بہر حال آپ اس سلسلے میں مزید تحقیق فرما لیں۔ ۲۹

سلور پرنٹ چونکہ سستا ہے اس لیے مجھے یہی حاصل کرنا ہے۔ آپ اسی کے حاصل کرنے کے لیے لائبریری کو لکھ دیجیے۔

ایک مرتبہ پھر آپ یہ بات جان لیجیے کہ مخطوطے کے جو صفحات نمبر لکھے ہیں، مجھے اس کے مطابق صرف ۴۸ اوراق کی ضرورت ہے۔ شاید آپ نے پورے مخطوطے کا حساب لگا لیا ہے۔

اب ایک چھوٹی سی گزارش ہے۔ آپ کی طرف میرے چھ سو روپے واجب ہیں۔ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ میں رقم یہاں ادا نہیں کر سکتا۔ لندن سے آپ کو مطلوبہ چیز یا چیزیں اسی رقم کے برابر بھیج دوں گا۔ میں نے عرض کیا تھا، ٹھیک ہے مجھے بعض کتابوں یا فوٹو اسٹیٹ کی ضرورت ہوگی، اس میں رقم منہا ہو جائے گی۔ اب آپ فرما رہے ہیں کہ میں فوٹو اسٹیٹ کی اجرت کا انتظام کر دوں! اس سادگی کی داد میں ہی دے سکتا ہوں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

اب کے تو آپ کو جو زحمت دی ہے سو دی ہے، آیندہ کے لیے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ حالانکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک بہت ضروری کتاب منگوانی ہے، اس کے لیے بھی آپ کو لکھوں گا لیکن اب ہمت نہیں پڑتی۔

بہر حال جس طرح بھی ممکن ہو، مذکورہ مخطوطے کا سلور پرنٹ حاصل کر کے مجھے ایر میل سے پوسٹ کر دیجیے۔ اگر آپ کو اس پر بھی اصرار ہو تو میں جملہ اخراجات یہاں پر آپ کے بہنوئی صاحب کو ادا کر دوں گا۔ چونکہ میری ضرورت شدید ہے اور میرا کام رکا ہوا ہے اس لیے میں مذکورہ سلور پرنٹ حاصل کرنے کے لیے مجبور ہوں۔ اگر ان تمام وضاحتوں کے باوجود آپ کی مالی حالت اجازت نہ دیتی ہو تو ازراہ کرم بوا پسی ڈاک مطلع فرمایئے۔ میں کوئی اور انتظام کرنے کی کوشش کروں گا۔ ۳۰

اور سنایئے کیا حالات ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یکم جنوری سے قبل آپ مقالہ مکمل کر لیں گے۔ مجھے امید ہے یہ مقالہ ہر اعتبار سے معیاری اور آپ کے شایان شان ہوگا۔ ۳۱

لندن میں خوب سردی پڑ رہی ہے اور یہاں سردی آئی ہی نہیں دن بھر گرمی رہتی ہے اور رات کو قدرے خنکی ہو جاتی ہے۔

پچھلے خط میں میں نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ جناب بشیر احمد ڈار صاحب شدید بیمار ہیں۔

والد صاحب قبلہ خیریت سے ہیں اور سلام لکھواتے ہیں۔ باقی باتیں سابقہ خط اور اس خط کا جواب آنے پر لکھوں گا۔

آپ کا مشفق خواجہ
۱۲ر دسمبر ۷۸ء

﴿۱۵﴾

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون۔

گرامی نامہ مورخہ ۱۹ دسمبر موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ آپ کی عنایت ہے کہ آپ نے میرے

مطلوبہ مخطوطے کا سلور پرنٹ بنانے کا آرڈر دے دیا ہے۔ میں اب انتظار کر رہا ہوں کہ یہ سلور پرنٹ مجھے مل جائیں اور میرا کام مکمل ہو۔ اس سلسلے میں آپ نے جو تعاون فرمایا ہے میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

رقم کا ذکر کرنے سے میں خفا نہیں ہوا۔ بس ذرا سا ملال ہوا تھا، سو وہ اب دور ہو گیا۔ آپ دل کے اچھے ہیں، لیکن زبان اور قلم کے نادر شاہ ہیں۔ خیر۔ رات گئی بات گئی۔

آپ نے انڈیا آفس کے جس کیٹلاگ کا ذکر کیا ہے، اس کی مجھے ضرورت تھی۔ لیکن پچھلے مہینے ہی میں اس کا عکس بنوا چکا ہوں۔ پاکستان جیسے غریب ملک میں پندرہ پیسے فی صفحہ کے حساب سے عکس بنا اور لندن میں fol 48 کے سترہ پونڈ سے زیادہ صرف ہو رہے ہیں، حالانکہ میں نے سنا تھا کہ لندن میں علمی کام بہ کفایت ہو جاتے ہیں۔ خیر میرے یا آپ کے سترہ پونڈ تا انجار ان برطانیہ کو راس نہیں آئیں گے۔ ان لوگوں نے ڈیڑھ سو سال تک ہماری ملکی دولت کا استحصال کیا ہے۔ اب یہ ہماری ذاتی دولت کے درپے ہیں۔

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کے مقالے کا پہلا مسودہ تیار ہو چکا ہے۔ ان شاء اللہ اب تک ٹائپ کا کام شروع ہو چکا ہوگا۔

اسپین جانے کا خیال مبارک ہو۔ مسجد قرطبہ میں تو آپ ضرور جائیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ وہاں ایک رجسٹر ہے جس میں تمام زائرین اپنا نام پتا لکھتے ہیں۔ ذرا علامہ اقبال کا نام اس رجسٹر میں تلاش کیجیے۔

آپ کے ہاں سخت سردی پڑ رہی ہے اور یہاں سردی آئی ہی نہیں۔ ڈار صاحب کو میں نے بھی خط لکھا تھا۔ ان کے صاحب زادے کا خط آیا تھا، نیز پیر راشدی صاحب سے بھی معلوم ہوا تھا کہ ڈار صاحب کی حالت تشویش ناک ہے۔ دعا کیجیے کہ خدا انھیں صحت کلی عطا فرمائے۔

والد صاحب قبلہ خیریت سے ہیں۔ آپ کا سلام پہنچا دیا تھا۔ وہ بھی دعا لکھواتے ہیں۔ میری کتابیں آپ نے کس کس کو دیں؟

مولانا حسن مثنیٰ صاحب سے اگر ملاقات ہوئی تو میرا سلام پہنچا دیجیے۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۳۰ دسمبر ۷۸ء

۱۶

۲۵ جنوری ۷۹ء

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون۔

آپ کا دس جنوری کا گرامی نامہ آج کی ڈاک سے ملا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ڈاک خانے کے محکمے میں جزوی ہڑتال جاری ہے۔ سنا ہے کہ کئی کروڑ خط جمع ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں میرا یہ خط آپ کو کب ملے گا۔

میرا یہ خط جب آپ کو ملے گا، اس وقت تک آپ کا مقالہ مکمل ہو چکا ہوگا۔ از راہ کرام تفصیل سے لکھیے کہ اس مقالے میں آپ نے کیا کچھ لکھا ہے؟

پچھلے دنوں ابوالخیر محمد فاروق (آسٹریلیا والے) یہاں آئے تھے۔ ان سے دو مختصر ملاقاتیں ہوئیں۔ آپ کا ذکر خیر رہا۔ وہ آپ کی اور آپ کے خوب صورت کیسٹ پلیئر کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔ فاروق صاحب نے اپنی کتاب مجھے دی۔ یہ مغل ہندوستان کی سڑکوں اور رسل و رسائل کے بارے میں ہے۔ یہ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے اور بڑی محنت سے لکھی گئی ہے[۳۲]۔

کل افتخار عارف سے بھی فون پر بات ہوئی۔ انھیں ابھی تک میری کتاب نہیں ملی۔ میں نے دوسرا نسخہ انھیں دے دیا تھا۔ آپ کے پاس جو نسخہ ہے وہ آپ کسی لائبریری کو دے دیجیے۔

میرے مطلوبہ فوٹو اسٹیٹ آ گئے ہوں تو انھیں جلد بھیجنے کی کوشش کیجیے گا۔ اگر ممکن ہو تو بذریعہ ایرمیل بھیج دیجیے گا اور رجسٹری۔ ڈار صاحب کے بیٹے سے فون پر بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ اب ڈار صاحب کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔

سلیم الدین قریشی صاحب نے جو کیٹلاگ ایڈٹ کیا ہے، وہ میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو زحمت نہیں دوں گا۔ قریشی صاحب سے کہیے کہ وہ اس کا invoice بنوا کر (میرے نام کا) بھیج دیں۔ اس کی بنا پر میں اسٹیٹ بنک سے اجازت لے کر اور اسی کے ذریعے کیٹلاگ کی قیمت اور بحری ڈاک کا خرچ بھیج دوں گا۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تبادلے میں اپنی کتاب ”جائزہ مخطوطات، جلد اول بھیج دوں۔ یہ ساڑھے بارہ سو صفحات کی کتاب ہے اور مخطوطات پر کام کرنے والوں کے لیے مفید ہو گی۔ یہ کتاب ابھی تک جلد سازی میں ہے۔ فروری کے مہینے میں بہر صورت منظر عام پر آ جائے گی۔

آج کل میرا کیمرا خوب کام کر رہا ہے۔ ہر مہینے دو چار فلمیں اتار لیتا ہوں۔ میرے بھائی صاحب نے مجھے فلیش گن بھی بھیج دی ہے۔ فلمیں بھی بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح یہ شوق پورا ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو زحمت یہ دینی ہے کہ از رہ کرم ذرا معلوم کیجیے کہ Ashipentax کیمرہ K1000 کی قیمت کیا ہے۔ اس کا لینس 1.2 ہے۔ نیز یہ بھی معلوم کیجیے کہ فلیش گن Sunpak Gx33 کتنے میں ملتی ہے؟

آپ کے اسپین جانے کی خبر مسرت بخش ہے لیکن حقیقی خوشی اس وقت ہوگی جب آپ سفر کے دوران ہر روز مفصل خط لکھیں۔ اس طرح میں بھی شریک سفر ہو جاؤں گا۔

یہاں کے حالات بدستور ہیں۔ والد صاحب قبلہ خیریت سے ہیں۔ آپ کو دعا لکھواتے ہیں۔ معین الدین عقیل اور اظہر حقی بھی خیریت سے ہیں۔ کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی ہے۔ مولانا ابوسلمان نے مولانا محمد علی کے مکتوبات مرتب کیے ہیں۔ آپ کا سلام آپ کی بھابی صاحبہ کو پہنچا دیا ہے۔ وہ بھی سلام لکھواتی ہیں۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون

آپ کے یکے بعد دیگرے دو خط ملے۔ ایک میں میرا خط نہ ملنے کی شکایت، اور دوسرے میں خط کا ذکر تھا۔ قصہ یہ ہے کہ پچھلے مہینے ڈاک والوں نے جزوی ہڑتال کر رکھی تھی، اس لیے ڈاک تاخیر سے ملی اور تاخیر ہی سے روانہ ہوئی۔ اب کہیں حالات معمول پر آئے ہیں۔ دو روز ہوئے بوڈلین لائبریری والوں نے ''دیوان قدرت'' کے عکس براہ راست مجھے بھیج دیے ہیں۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ یہ آپ کے پاس پہلے آئے تو یہاں آنے میں وقت صرف ہوتا اور اگر آپ انھیں مولانا حسن مثنیٰ ندوی صاحب کے ہاتھ بھیجتے تو پھر قیامت کے روز ہی ملتے۔ لفافے پر 2.70 کے ٹکٹ لگے تھے اور یہ ہوائی ڈاک سے آیا ہے۔ یہ آپ کا ایسا لطف خاص ہے جسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اب کیٹلاگ بھی آ جائے تو آپ کے سلسلہ احسانات کی تکمیل ہو جائے گی۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کا مقالہ پسند کیا گیا۔ مجھے اس کا پہلے ہی یقین تھا کہ آپ مقالہ بہت اچھا لکھیں گے۔ دراصل بات یہ ہے کہ آپ جس کام کا ارادہ کر لیں، وہ کر ہی لیتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ تساہل کی وجہ سے ادھر ادھر کی دل چسپیوں میں وقت صرف کر ڈالتے ہیں۔ مقالے کا جو خاکہ آپ نے لکھا ہے وہ بھی نہایت جامع ہے۔

آپ نے اپنے ذاتی مسئلے پر جو میری رائے طلب کی ہے تو عرض ہے کہ آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہیں رہ کر ڈاکٹریٹ کی تکمیل کریں۔ یہاں کسی علمی ادارے سے وابستگی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہاں ڈاکٹریٹ کی صورت میں یہ امکانات بہت زیادہ ہو جائیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں رہ کر آپ پی ایچ ڈی نہیں کر سکتے۔ ذہنی پریشانیاں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گی۔ روانگی کے وقت آپ کی جو ذہنی کیفیت تھی وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ آپ نے علم کے میدان میں کچھ کر گزرنے کا جو عزم کیا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ہر طرح کی پریشانیوں سے محفوظ رہیں۔ جہاں تک حصص کے نقصان کا تعلق ہے تو پہلے ہی آپ نے کون سا سود و زیاں سے واسطہ رکھا ہے۔ آپ نے ہمیشہ سود و زیاں سے بلند رہ کر سوچا ہے، اب بھی اسی پر عمل کیجیے، لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ نقصان میں نہیں رہیں گے اور ویسے بھی مادی طور پر آپ کو حصص کے تعلق سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔

یہ خط میں ایسے وقت میں لکھ رہا ہوں کہ آپ اسپین کی سیاست میں مصروف ہوں گے اور جب تک یہ خط آپ کو ملے گا، آپ لندن واپس آ چکے ہوں گے۔ اسپین کی سیاحت کا حال مفصل لکھیے تاکہ میں روحانی طور پر آپ کا شریک سفر ہو سکوں [۳۳]۔

باقی آپ کے خط آنے پر۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

مولانا حسن مثنیٰ ندوی صاحب کی خدمت میں سلام۔ وہ وہاں کیا کر رہے ہیں اور کہاں مقیم ہیں؟

آپ کا

مشفق خواجہ

۱۹ فروری ۷۹ء

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون

آپ کا تازہ ترین خط مکتوبہ ۲۱ مارچ کل شام کو ملا تھا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میرا ۱۹ فروری کا خط آپ کو کامل ایک مہینے بعد ملا۔ شاید اس کا سبب یہ ہوگا کہ آپ چونکہ سفر میں تھے، اس لیے یہ خط آپ کے ہوسٹل کے دفتر میں پڑا رہا ہوگا۔

اس سے پہلے آپ کے تین خط ملے تھے۔ دو آپ نے اسپین میں لکھے تھے اور ایک مراکش سے۔ یہ آپ کا کرم ہے کہ آپ نے سفر میں بھی مجھے یاد رکھا۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو دنیا کے مختلف خطوں کی سیاحت کا موقع ملتا ہے اور میں خوش قسمت ہوں آپ کے سفر کی روداد سے محظوظ ہوتا ہوں۔ یہ خطوط اگرچہ مختصر تھے لیکن ایک مسافر سے اس سے زیادہ طویل خطوں کا طالب ہونا مناسب نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے اپنی ڈائری میں زیادہ تفصیل سے کام لیا ہوگا۔ خدا نے چاہا تو حسب سابق اس ڈائری سے لطف اندوز ہونے کا موقع ضرور ملے گا۔

''دیوان قدرت'' کے عکس کے لیے ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس عکس پر جو مصارف ہوئے ہیں، ان کا خیال کر کے دل کانپ اٹھتا ہے۔ اتنی رقم اگر مصنف دیوان کو اس کی زندگی میں مل جاتی تو اس کا سال دو سال کا خرچ آسانی سے نکل آتا۔ میں نے سنا تھا کہ لندن میں عکس کا خرچ دو چار پنس فی صفحہ ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا''۔

میری کتاب جو لاہور میں چھپ رہی تھی، اس کی طباعت نومبر ۷۸ء کے وسط میں مکمل ہو گئی تھی۔ اس وقت سے اب تک جلد سازی کا کام ہو رہا ہے۔ ہمارے اداروں میں اسی طرح سست رفتاری سے کام ہوتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ اداروں میں کام کرنے والے اہلیت و صلاحیت کی بجائے سفارش کے ذریعے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ بہرحال جس وقت بھی کتاب ملی، آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے سلیم الدین قریشی صاحب سے کہہ دیا کہ وہ اپنے کیٹلاگ کا ایک نسخہ مجھے بھیج دیں۔ میں اس کے لیے چشم براہ رہوں گا۔

میری دوسری کتاب ''اقبال'' از احمد دین، انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ کے شروع میں طباعت مکمل ہو جائے گی تو آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔

آپ کی کتاب ''زمان و مکان'' پر فی الحال تو تبصرے کرا رہا ہوں۔ نفیس اکیڈمی سے کوئی معاملہ طے نہیں ہوا۔ کتاب چونکہ ان کے پریس میں چھپی ہے لہٰذا تبصرے میں انھیں کا نام دے دیا ہے۔ انھوں نے فی الحال دس نسخے فروخت اور واپسی کے اصول پر لیے ہیں۔ کتاب کی فروخت مایوس کن ہے۔ سبب یہ ہے کہ یہاں ڈائجسٹ وغیرہ زیادہ بکتے ہیں۔ میں نے تو اپنی کتاب کی فروخت سے مایوس ہو کر اس کا بڑا حصہ لائبریریوں اور اہل علم میں تقسیم کر دیا ہے۔ آپ کی کتاب پر ایک اور تبصرہ شائع ہوا ہے۔ بھیج رہا ہوں۔

سابقہ فلموں میں سے دو تین تصویریں صحیح نکلی ہیں۔ ان میں ایک آپ کی ہے۔ بھیج رہا ہوں۔ میرا فوٹوگرافی کا شوق

عروج پر ہے۔ آپ کا نتیجہ کب آ رہا ہے؟ آج کل کیا شغل ہے؟

مولانا حسن مثنیٰ ندوی کی خدمت میں سلام پیش کر دیجیے۔ والد صاحب قبلہ لاہور تشریف لے گئے ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

احتیاطاً یہ خط رجسٹری سے بھیج رہا ہوں۔

بخدمت گرامی
جناب حمزہ فاروقی
لندن

آپ کا
مشفق خواجہ
۳/اپریل ۷۹ء

﴿۱۹﴾

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون

آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے دلی دکھ ہو رہا ہے کہ میرے اور آپ کے مہربان جناب بشیر احمد ڈار اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ۲۹ مارچ کو صبح ساڑھے دس بجے کے قریب انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ افسوس صد افسوس کہ ایک مخلص اور انسان دوست شخصیت ہمارے درمیان سے اٹھ گئی۔ ان جیسا دوسرا صاحب علم و قلم کوئی نظر نہیں آتا۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ڈار صاحب جیسا ممتاز اہل علم انتقال کر جائے اور اخباروں میں دو سطری خبر بھی شائع نہ ہو۔ مجھے ان کے انتقال کی اطلاع کل ہی ایس ایم میر صاحب نے فون پر دی ہے۔ ڈار صاحب اکتوبر میں بیمار پڑے تھے۔ چھ مہینے کے اندر اندر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرض کینسر کا تشخیص ہوا تھا۔ سنا ہے آخری زمانے میں مختلف دوائیوں کا ردعمل خراب ہوا۔ ذہن بھی متاثر ہو گیا تھا۔ بستر سے اٹھ کر باہر جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس وجہ سے کئی مرتبہ شدید جسمانی چوٹیں بھی آئیں۔ آپ مرحوم کی بیگم صاحبہ کو تعزیت کا خط لکھ دیجیے۔ پتا وہی ہے جس پر آپ نے ڈار صاحب کو خط لکھا تھا۔

اگر آپ ڈار صاحب سے اپنی ملاقاتوں کا حال قلم بند فرما دیں تو میں اسے یہاں کے کسی اخبار یا رسالے میں چھپوا دوں گا۔ محمد عبداللہ قریشی صاحب کو بھی میں نے مضمون لکھنے کے لیے کہا ہے۔

مولانا مہر سے متعلق اپنے مضمون کی نقل بھی بھیج دیجیے۔ ان کی برسی پر اسے بھی چھپوا دوں گا۔

اب اس سے زیادہ نہیں لکھا جاتا۔ طبیعت سخت اداس ہے۔ یقین نہیں آتا کہ ڈار صاحب اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔ آمین

بخدمت گرامی
جناب محمد حمزہ فاروقی
لندن

آپ کا
مشفق خواجہ

﴿۲۰﴾

۵ فروری ۱۹۸۰ء ۳۴

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون:۔

آپ کا ۲۹ جنوری کا گرامی نامہ آج ملا ہے۔

آپ نے والد صاحب کی خیریت پوچھی ہے۔ اس بات نے دل لہولہان کر دیا۔ دسمبر کی ۲۸ کو وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور ہمیں ہمیشہ کے لیے سوگوار چھوڑ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دسمبر کے شروع میں ان کی طبیعت بہت بہتر ہو گئی تھی اور ہم نے ۳ جنوری کو ان کی سالگرہ بڑے پیمانے پر منانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد سے بہت سے لوگوں کو مدعو کیا۔ مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ ۲۵ کو ان کی طبیعت بگڑی، ۲۶/۲۷ کو وہ اسپتال میں رہے اور ۲۷/۲۸ کی درمیانی شب کو بارہ بج کر آٹھ منٹ پر رحلت فرما گئے۔ میں نے اجمل صاحب سے فون پر عرض کیا تھا کہ آپ کو اطلاع دے دیں۔ اس حادثے نے دل و دماغ کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔

سلیم الدین قریشی صاحب کا کیٹلاگ مجھے نہیں ملا۔ شاید وہاں سے بھیجا ہی نہیں گیا۔ اس کی مجھے جتنی شدید اور فوری ضرورت تھی، اتنی ہی تاخیر ہو رہی ہے۔ اگر آپ اس سلسلے میں فوری توجہ فرما سکیں تو کرم ہوگا۔

مفصل خط میں ان شاء اللہ آپ کا جواب آنے پر لکھوں گا۔ اپنا پتا صاف اور واضح لکھیے۔

خدا کرے آپ مع بھابی صاحبہ کے خیریت سے ہوں۔

بخدمت گرامی
جناب محمد حمزہ فاروقی
لندن

آپ کا مخلص
مشفق خواجہ

﴿۲۱﴾

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون

آپ کا پہلا گرامی نامہ مل گیا تھا۔ جس میں آپ نے والد صاحب مرحوم کی تعزیت کی تھی۔ اس کا جواب میں نے فوراً لکھ دیا تھا۔ غلطی یہی کی کہ پوسٹ کرنے کے لیے ایک چپراسی کو دے دیا۔ اس نے یقیناً ٹکٹ کے پیسے جیب میں رکھے ہوں گے اور خط ضائع کر دیا ہوگا۔ اب یہ خط میں خود پوسٹ کروں گا۔

والد صاحب مرحوم کی دائمی مفارقت نے زندگی کو بے مزہ کر دیا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میں کس قدر ان سے وابستہ تھا۔ علمی کاموں میں بھی اسی لیے مزہ آتا تھا کہ ان کی داد ان سے ملتی تھی۔ آپ سے بھی انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ آخری دنوں میں کئی بار آپ کو یاد کیا تھا۔ بیماری کے دوران آپ جب بھی ان سے ملنے کے لیے آتے تھے تو وہ بے حد خوش ہوئے تھے۔ انھوں نے اکثر لوگوں سے اس کا ذکر کیا تھا کہ حمزہ صاحب کراچی آتے ہی مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ دعا کیجیے کہ خداوند تعالیٰ انھیں درجات عالیہ عطا فرمائے۔

میں ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے فوری طور پر تین کام کر رہا ہوں:۔

(۱) ان کے بارے میں ایک مجموعہ مضامین۔ اس میں ان کے دوستوں اور جاننے والوں کے مضامین ہوں گے۔ آپ بھی اس کے لیے ایک مضمون ضرور لکھیے جو جو باتیں یاد آئیں، قلم بند کر دیجیے۔

(۲) ان کا روزنامچہ مرتب کر رہا ہوں۔ اس میں پچاس سال پہلے کے لاہور کی پوری علمی، ادبی اور ثقافتی تاریخ آ گئی ہے۔

(۳) ان کے نام مشاہیر (ابوالکلام آزاد، اقبال، سید سلیمان ندوی) کے خطوط کا بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ خط بھی کتابی صورت میں شائع کروں گا۔

آپ سے میں نے عرض کیا تھا کہ میرا ارادہ ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کا ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ اس کی صورت نکل آئی ہے۔ آج کل میں اس کام پر خاصا وقت دے رہا ہوں۔ تمام ممتاز اہل قلم کا تعاون حاصل ہو گیا ہے۔ اب آپ اس کے پہلے شمارے کے لیے اپنے سفرنامے کا اسپین سے متعلق حصہ جلد از لکھ کر مجھے بھیج دیجیے۔ ضخامت کی آپ پروا نہ کیجیے۔ بس یہ شرط ہے کہ سفرنامہ حسب سابق دل چسپ ہونا چاہیے[۳۵]۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں یہ کام انجام دیں گے۔

مولانا مہر سے متعلق کتاب بھی اب آ جانا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ جتنا کام آپ نے کر لیا ہے، وہی کافی ہے۔ جو کاغذات آپ نے مجھ سے منگوائے تھے، ان پر ایک نظر ڈال کر واپس بھیج دیجیے۔ میں مولانا ابوسلمان صاحب سے اس کی نظر ثانی کرا کے شائع کر دوں گا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے کیٹلاگ روانہ کر دیا ہے۔ اصل خوشی اس وقت ہو گی جب یہ ملے گا۔ دو سال سے اس کی آمد آمد کی خبر سن رہا ہوں۔ اتنا انتظار تو میں نے کسی محبوب کا بھی نہیں کیا جتنا اس کا کرنا پڑا۔

اپنی کتابیں میں عنقریب آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا۔ ڈاک سے پہنچنے میں دیر لگے گی۔ میرے ایک جاننے والے لندن جا رہے ہیں، ان کے ہاتھ بھیج دوں گا۔

احباب خیریت سے ہیں۔ جب ملاقات ہوتی ہے آپ کا ذکر خیر ضرور آتا ہے۔ آپ نے اپنے حالات تفصیل سے نہیں لکھے۔ آج کل کیا مشاغل ہیں؟ پی ایچ ڈی کا معاملہ کہاں تک پہنچا؟ امریکہ میں کہاں کہاں کی سیر کی اور آیندہ کیا کیا ارادے ہیں؟ ان سب امور سے متعلق تفصیل سے لکھیے۔

آپ اکثر یاد آتے ہیں۔ آپ کا خلوص، آپ کی شفقت، اس زمانے میں ناپید ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس دنیا میں آپ جیسے وسیع القلب انسانوں کا تناسب بڑھ جائے تو یہ دنیا واقعی رہنے کے قابل بن جائے۔

جنوری میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب دوبارہ کراچی آئے تھے، وہ بھی آپ کے خلوص کے تہِ دل سے قائل ہیں۔ کل پروفیسر ممتاز حسین آئے تھے، آپ سے ملنے کے شائق تھے۔ اب آپ آئیں گے تو ان سے ضرور ملیے۔

اچھا اب اجازت دیجیے۔ میری مندرجہ ذیل گزارشات پر عمل کیجیے:

۱۔ اپنے تفصیلی حالات و کوائف لکھیے۔ یعنی یہ کہ کس عالم میں گزر رہی ہے؟

۲۔ والد صاحب قبلہ مرحوم کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند فرما دیجیے۔

۳۔ میرے رسالے کے لیے اسپین کا سفرنامہ تحریر فرما دیجیے۔ جلد از جلد۔ پہلا شمارہ کتابت ہو رہا ہے۔ یہ تقریباً سات سو صفحات کا ہو گا۔[۳۶]

۴۔ مولانا مہر سے متعلق کام پر توجہ کیجیے۔

خدا کرے آپ اور بیگم صاحبہ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۱۲ مارچ ۸۰ء

بھائی جان! اپنا پتا الگ الگ انگریزی حروف میں لکھیے۔ موجودہ صورت میں یہ بالکل سمجھ میں (نہیں) آیا۔

تعلیقات وحواشی

۱۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب روزنامہ ''جسارت'' میں سیاسی اور ادبی کالم لکھتے تھے۔

۲۔ ''زمان ومکاں اور بھی ہیں'' مارچ ۱۹۷۸ء میں ''عصری مطبوعات'' کراچی سے شائع ہوئی تھی۔

۳۔ یہ خط ڈاک میں ضائع ہو گیا۔

۴۔ انگلستان آنے سے پیشتر میں نے اپنی اہم کتابیں خواجہ صاحب کے ہاں رکھوا دی تھیں۔

۵۔ ''سفرنامہ اقبال'' اشاعت اول ۱۹۷۳ء۔ مکتبہ معیار۔ کراچی

۶۔ خواجہ عبدالوحید صاحب

۷۔ ڈاکٹر نذیر محمد فاروقی مرحوم

۸۔ ''نقوش مہر'' بعض موانع کے سبب شائع نہیں ہو سکی۔

۹۔ چند سطریں بہ وجوہ حذف کر دیں۔

۱۰۔ ''سفرنامہ اقبال'' کا دوسرا ایڈیشن ترامیم اور اضافوں کے بعد ۱۹۸۹ء میں ''مکتبہ اسلوب'' کراچی سے شائع ہوا تھا۔

۱۱۔ ''اردو شاعری کا تہذیبی وسیاسی پس منظر''۔ از ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی۔ ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''۔ از ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ یہ ان حضرات کے ڈاکٹریٹ کے مقالے تھے۔

۱۲۔ ''اقبال اور مسئلہ فلسطین''۔ ''اقبال ریویو'' جولائی ۱۹۶۹ء

۱۳۔ خواجہ صاحب کو رالف رسل کے بارے میں بہت خوش گمانی تھی۔ SOAS میں اردو کا لیکچرر تھا۔ بعد میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ریٹائر ہوا۔ کئی کتب کا مصنف اور مترجم ہے۔

۱۴۔ قاضی محمود الحق اس وقت برٹش میوزیم لائبریری کے شعبہ ترقی کے نگران تھے۔

۱۵۔ سید معین الدین شاہ

۱۶۔ ''سفر آشوب'' ۱۹۸۷ء میں ''مکتبہ اسلوب'' کراچی سے شائع ہوئی۔

۱۷۔ مجھے اپنی کتاب کا شدت سے انتظار تھا۔ عالم اضطراب میں میں نے جو خط لکھا وہ خواجہ صاحب کی دل آزاری کا موجب بنا۔

۱۸۔ کتاب ملنے پر میں نے لندن کے ''دیوانہ'' ریستوران میں اپنے ساتھیوں اور اساتذہ کی دعوت کی تھی۔

اسے اپنے اور لوگوں کے سامنے بہ آواز بلند پڑھا اور میرے ردعمل کے منتظر رہے۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ میرے سفرنامے میں اس سے کہیں زیادہ غلطیاں تھیں لیکن بہتر ہوتا کہ آپ سنی سنائی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے خود اسے پڑھتے اور غلطیوں کی نشان دہی کرتے۔

۲۰ یہ صفحات خالی تھے۔

۲۱ SOAS میں ایم اے کے ایک پرچے میں امتحان کے بجائے مختصر مقالہ پیش کیا جاتا تھا۔

۲۲ کراچی میں میرا قیام ۲۱ جولائی سے ۲۷ ستمبر ۱۹۷۸ء تک رہا تھا۔

۲۳ ''دیوان قدرت'' کا قلمی نسخہ بوڈلین لائبریری، آکسفورڈ کے شعبہ علوم شرقی میں پایا جاتا تھا۔ اس کا حوالہ درج ذیل ہے:

MS. Elliott 285; folios 209 v-256R

۲۴ میں نے ۲۷ ستمبر سے ۳۰ ستمبر ۱۹۷۸ء کا وقفہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بسر کیا تھا۔

۲۵ جائزہ مخطوطات اردو۔

۲۶ یہ خواجہ صاحب کا مجموعہ شعری ''ابیات'' تھا۔

۲۷ کسی مخطوطے کی عکسی نقل کا حصول اس قدر آسان نہ تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے براہ راست بوڈلین لائبریری کو خط لکھا تھا۔

۲۸ مولانا حسن مثنیٰ ندوی موتمر عالم اسلامی کے نمائندے کی حیثیت سے مفتی ضیاء الدین بابا خانوف کی دعوت پر روس گئے تھے۔ وہاں آپ نے تاشقند، سمرقند، بخارا، بحریہ خواجہ، لینن گراڈ اور ماسکو کا دورہ کیا تھا اور ۸/اکتوبر ۱۹۷۸ء میں لندن تشریف لائے۔ آپ نے ڈاکٹر خالد حسن قادری کے ہاں قیام کیا تھا۔

۲۹ خواجہ صاحب کے ذہن میں پرانے زمانے کے پونڈ کا تصور تھا۔ جب ۱۲ پنس کا ایک شلنگ اور ۲۰ شلنگ کا پونڈ ہوتا تھا۔ اعشاری نظام رائج ہونے کے بعد پرانے سکے رفتہ رفتہ متروک ہو گئے اور نئے ۱۰۰ پنس کے پونڈ کا رواج عام ہو گیا تھا۔

۳۰ ۱۹ دسمبر ۱۹۷۸ء کو میں نے ۱۷ پونڈ کا چیک بوڈلین لائبریری کے نام بھیج دیا تھا۔ اور انھوں نے ۸ فروری ۱۹۷۹ء کو مخطوطے کی عکسی نقل براہ راست خواجہ صاحب کو ہوائی ڈاک کے ذریعے بھیج دی۔

۳۱ مقالہ ۳۱ جنوری ۱۹۷۹ء کو مکمل ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔

Socio- Political Aspects of Urdu Leterature during 1857 and its Aftermoths.

اور یہ ''ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان'' کے جرنل کی تین اشاعتوں میں جنوری۔ اپریل اور اکتوبر کی تین اقساط میں شائع ہوا تھا۔

۳۲ ڈاکٹر ابو الخیر محمد فاروق آسٹریلیا کی کسی یونی ورسٹی میں لیکچرر تھے۔ یہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں لندن آئے تو انٹرنیشنل ہال میں ٹھہرے تھے۔ اس زمانے میں ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے انھیں خواجہ صاحب کا پتا اور فون نمبر دیا تھا۔

۳۳ میں نے اسپین اور مراکش کا سفر ۱۱ فروری سے ۲۷ فروری ۱۹۷۹ء کے دوران کیا تھا۔

۳۴ اس خط پر تاریخ درج نہ تھی۔ ایروگرام پر مہر کی مدد سے تاریخ متعین کی تھی۔

۳۵ یہ سفرنامہ ۱۹۸۲ء میں ''مکتبہ اسلوب'' کراچی نے شائع کیا تھا۔ خواجہ صاحب نے ''آج بھی اس دیس میں'' کا مسودہ دیکھنے کے بعد اسے رسالے میں شائع کرنے کی بجائے کتابی شکل میں چھپوانا بہتر سمجھا۔

۳۶ سہ ماہی ''تخلیقی ادب'' کراچی۔

غالب کا ایک خط بنام سرسید احمد خاں

پرتو روھیلہ

سید عالی جناب، خدا آپ کو سلامت رکھے۔

جناب کے فرمان الفت آثار کے پہنچنے سے مجھے خوشی ہوئی۔ لیکن جس کام کی تعمیل کا حکم دیا گیا ہے اس سے رنجیدہ (ہوا)۔ کسی (شاعر) کے ایک دو شعر لے کر اس کلام پر اپنی طرف سے دو چار اشعار کا اضافہ کر دینا (بھلا) کون سا اصول سخن وری اور انداز معنی پروری ہے۔ خاص طور پر یہ دو اشعار کہ جن میں سوائے عربی کے بھاری بھرکم الفاظ کے کوئی نازک خیالی موجود نہیں۔ اور مزید یہ کہ یہ ایسی بحر میں کہے گئے ہیں کہ ایرانیوں میں سے (بھی) کسی نے اس بحر میں غزل نہیں کہی۔ اس میں دو اشعار بڑھا کر چاہے اس کو مسدس نام دیں یا ترجیع بند کے نام سے پکاریں۔ خصوصاً یہ اس لائق ہیں کہ بھکاری ان کو یاد کر لیں اور دروازے دروازے پُرسوز لے میں گاتے پھریں اور خاتم المرسلین کا کوئی عاشق یہ اشعار سن کر بے خود ہو جائے اور کوئی اپنا گریبان پھاڑ ڈالے۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں (مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔)

مخدومی مولوی غلام امام شہید سلمہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہے اور اس سے بہتر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ شاعری اور سخنوری نہیں ہے۔ یہ کوئی دوسری چیز ہے جسے مجلس مولود شریف کہا جا سکتا ہے۔ اس فقیر نے نعت اشرف المرسلین علیہ وآلہ السلام میں قصیدے اور مثنویاں کہی ہیں۔ ان تمام میں سے ایک مثنوی نقل کر کے ارسال کر رہا ہوں۔ اس کو دیکھیں اور پڑھیں اور اس خادم سے ایسے اشعار کی جو شیوۂ سخنوری کے خلاف ہوں آرزو نہ کریں۔ اور مجھے اپنا خادم تصور کریں اور اپنے برادر بزرگ کی خدمت میں میرا اسلام پہنچائیں۔ والسلام۔ از اسد اللہ

﴿توضیحات﴾

''یہ خط سرسید احمد خان کے نام اس وقت لکھا گیا جب وہ فتح پور سیکری میں بہ حیثیت منصف تعینات تھے اور چونکہ مین پوری سے ان کا تبادلہ فتح پور سیکری کے لیے بتاریخ ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء اور جہاں وہ ۱۸ فروری سے ۱۸۴۷ء تک رہے اس لیے یہ حتمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خط ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء کے بعد ۱۸ فروری ۱۸۴۷ء تک کسی تاریخ کو لکھا گیا۔ خط کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ تاجدار مغلیہ کے دربار سے ان کو ''جوادالدولہ سید احمد خان بہادر عارف جنگ کا خطاب مل چکا تھا لیکن تا حال وہ ''سر'' نہیں ہوئے تھے۔ خط کی شان نزول یہ ہے کہ سرسید احمد خان نے غالب کو غلام امام شہید کے دو نعتیہ اشعار بھیج کر ان پر تضمین کرنے کی فرمائش کی تھی۔ غلام امام شہید الہ آباد کے رہنے والے اور محمد حسن قتیل کے شاگرد تھے۔ نواب محی الدولہ اور راجہ گردھاری پرشاد کی بے انتہا قدر و منزلت کے سبب حیدر آباد میں متمکن تھے جہاں مولود پڑھنے اور نعت گوئی کے سبب ان کے عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ غالب نے جنھیں محمد حسن قتیل سے کلکتہ کے قیام کے زمانے سے (مرحوم کے شاگردوں کی وجہ سے: مترجم) پرخاش تھی اور

شہید سے اس لیے بیر تھا کہ حیدر آباد میں ان کی انتہائی قدر و منزلت ہو رہی تھی، اس فرمائش کو اپنی کسر شان سمجھا اور جواب میں لکھ بھیجا کہ یہ اشعار سچی شاعری اور سخنوری کے محیط سے باہر ہیں ہاں البتہ اس لائق ضرور ہیں کہ بھکاری ان کو لہک لہک کر دروازے دروازے گاتے پھریں۔ ''نعت میں، میں نے بھی قصیدے اور مثنویاں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک مثنوی ارسال کر رہا ہوں۔ اس کو دیکھیں اور پڑھیں اور اس خادم سے ایسے اشعار کی جو شیوہ سخنوری کے خلاف ہوں آرزو نہ کریں''۔

یہ خط نثار احمد فاروقی کی ''تلاش غالب'' مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ ۱۹۹۹ء سے لیا گیا ہے۔ جس میں خط کے ماخذ کے بارے میں مندرجہ ذیل تحریر ملتی ہے۔ ''اس خط کا ماخذ ایک قلمی نسخہ ہے جس میں بہار دانش وغیرہ متعدد کتابیں ہیں۔ یہ (نسخہ) انجمن محمدیہ آگرے کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اسی کے ایک سادہ ورق پر کسی نے غالبؔ کا یہ خط نقل کر دیا ہے۔ اس کی پیشانی پر ایک مہر بھی لگی ہوئی ہے (اصلح الدین ۱۲۶۷ھ) صاف پڑھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خط غالبؔ کی زندگی میں نقل ہوا ہے''۔

(تلاش غالب۔ از نثار احمد فاروقی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، ۱۹۹۹ء)

''غم زمانہ بھی سہل گزرا'' منظوم سوانح کا نقش اولیں

یونس حسن

منظوم سوانح لکھنا یقیناً بہت مشکل اور دقیق کام ہے۔ اردو ادب میں اس کا اولین نقش جناب ادیب سہیل کے ہاں ملتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی منظوم سوانح ''غم زمانہ بھی سہل گزرا'' ایک حوالے کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ ان کی یہ منظوم سوانح محض ان کی زندگی کی کہانی نہیں بلکہ ایک معاشرتی، تہذیبی، تمدنی، عمرانی، ثقافتی اور سیاسی نشیب و فراز کی داستان ہے۔ بطور شاعر ادیب سہیل کا مشاہدہ نہایت عمیق اور گہرا ہے۔ وہ حالات و واقعات کی اس طرح فوٹو گرافی کرتے ہیں کہ جزئیات تک سامنے آ جاتی ہے۔ ان کے ہاں لفظ نت نئے شعری سانچوں میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں اور ایک عہد کے تہذیبی اور سماجی رویوں کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ مزید براں عصری حالات میں رونما ہونے والے تغیرات اور تبدیلیوں کی جھلک بھی ان کی اس منظوم سوانح میں صاف دیکھی جا سکتی ہے۔

اس منظوم سوانح کا آغاز جناب ادیب سہیل کے بچپن کے حالات اور ان کی خوشگوار یادوں سے شروع ہوتا ہے۔ وہ یادیں اور خوشگوار لمحے جو ایک خواب بن کر انسانی زندگی میں آتے ہیں اور دائمی نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے جیسے انسان کی عمر بیتتی ہے ان کا تاثر زیادہ گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ادیب سہیل نے اپنا بچپن، لڑکپن، جوانی اور حال جیسے بتایا ہے اس کے ان گنت رنگ اس سوانح میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ہر رنگ اپنے ہونے کی دلیل دے رہا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ شاعر جب نظم میں اپنی قلبی کیفیات، جذبات و احساسات کو پیش کرتا ہے تو ایک رومانوی سی فضا دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ لفظ مخصوص شعری آہنگ میں ڈھلنے کے بعد ایک جادوئی سی تاثیر کے حامل بن جاتے ہیں۔ نادر تشبیہات، استعارات، علامات اور صفتوں سے یہ کیفیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک عاشق صادق کے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہوں۔ انہیں شعر میں اظہار کرنا آتا ہے۔ یہ اظہار اپنے اندر گہری معنویت لیے ہوئے ہے۔ ان کے شعر کا ہر مصرعہ جذبات کی شدت، بیان کی ندرت، بے ساختگی، شگفتگی، دلکشی اور رعنائی کے نت نئے شیڈز لیے سامنے آتا ہے۔ وہ لفظوں سے تصویریں بناتے ہیں۔ یہ تصویریں محض تصوراتی یا تخیلاتی نہیں ہوتیں بلکہ حقائق پر مبنی ہوتی ہیں۔ ان تصویروں کا کوئی بھی پہلو ادھورہ یا تشنہ نہیں بلکہ زندگی کی حرارت سے بھرپور نظر آتا ہے۔

ادیب سہیل نے واقعات کو اس طرح منظوم کیا ہے کہ مناظر اور ماحول کی جزئیات تک سامنے آ گئی ہیں۔ لفظوں میں ایک فطری بہاؤ اور روانی ہے۔ کہیں بھی الجھاؤ اور بکھراؤ نہیں۔ شاعر کو زبان پر قدرت ہے۔ لفظ شعر کے سانچوں میں اس طرح ڈھلے ہیں کہ جیسے نگینے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک بھی لفظ نکالیں تو پورے شعر کا مفہوم زائل ہو جائے۔ بیان کا انداز نہایت دلچسپ ہے۔ قاری جیسے جیسے پڑھتا ہے اس کے سامنے ادیب سہیل کی شخصیت کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ ایک ایسے شاعر کی جو نہایت

حساس اور شرمیلا ہے، جو بعض اوقات جذبوں کے اظہار سے بھی کتراتا ہے جس کے دل میں اپنے محبوب کے لیے نہایت معصوم سی آرزوئیں اور تمنائیں ہیں۔ وہ محبوب جو اس کے لیے زندگی کی نہایت قیمتی متاع ہے۔ جس سے اس کی دھڑکنیں جڑی ہوئی ہیں۔ ایک پل بھی جس سے دور رہنا قیامت سے کم نہیں۔ محبوب کے حسن و جمال اور سراپے کے نقوش اس کے اشعار میں ڈھل کر مجسم صورت اختیار کر گئے ہیں۔

ان کی اس منظوم سوانح کا مرکزی کردار عارفہ ہے جو شاعر کی تمناؤں اور آرزوؤں کا محور ہے۔ اس سے شاعر کو والہانہ پیار اور محبت ہے۔ یہ محبت اس حوالے سے لازوال ہے کہ آدھ صدی گزرنے کے بعد بھی اس میں کمی نہیں آئی۔ وقت اور حالات میں نہ جانے کتنے ہی نشیب و فراز آئے لیکن اس محبت کا کوئی بھی رنگ پھیکا نہیں پڑا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ مضبوط اور پائیدار ہوتا چلا گیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ سوانح محبت کے عظیم اور انمٹ رنگوں سے عبارت ہے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ ان رنگوں کی قوس قزح آج بھی ہر سطح پر اپنی انفرادیت قائم کرتی نظر آتی ہے۔

اس منظوم سوانح میں ادیب سہیل نے اپنے ہم عصر دوستوں اور عزیزوں کے جو خاکے کھینچے ہیں وہ بے حد جاندار ہیں۔ اپنے نجی حالات و واقعات کے ساتھ وہ اس دور کے عمومی رجحانات، اقدار و روایات اور تہذیبی سیٹ اپ کی جھلکیاں بھی دکھاتے چلے گئے ہیں جس سے یہ سوانح اس عہد کی ڈاکومنٹری فلم کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ رونما ہونے والا ہر اہم واقعہ اس کے اندر محفوظ ہوتا چلا گیا ہے۔ تمام واقعات اپنی پوری صحت کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ کہیں بھی واقعات کی صحت مشکوک نہیں ہے۔ ہر واقع کا صحیح تناظر اور پس منظر واضح کیا گیا ہے۔ ان واقعات کی صحت اس لیے مشکوک نہیں ہوئی کہ اس کا قلم بند کرنے والا ادیب سہیل ہے۔ اس نے جو دیکھا ہے اس کو سند کے ساتھ شعر کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔

اس سوانح کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ادیب سہیل کو پڑھنے کا شوق کلکتہ میں پیدا ہوا جب وہ نوکری کی تلاش میں وہاں مقیم تھے۔ ان کی قیام گاہ کے قریب ایک کھولی تھی۔ وہاں ایک نیپالی جوڑا رہتا تھا۔ جن کا پیشہ ردی خریدنا اور بیچنا تھا۔ یہ ردی کی تلاش میں گلی گلی گھومتے۔ جو ردی خریدتے کھولی میں آ کر اس کی درجہ بندی کرتے اور پھر اسے کسی کباڑیے کی دوکان پر بیچ آتے۔ رات کو وہ انہی ردی کاغذوں پر سوتے۔ یہ کھولی چونکہ شاعر کے گھر کے بالکل قریب تھی اس لیے اسے وہاں جانے کا اتفاق ہوتا رہتا۔ وہاں ردی میں اسے نہایت نایاب کتابیں اور رسائل پڑھنے کو ملے۔ ان کتب اور رسائل کے مطالعے سے ان میں پڑھنے کی ایک نہ ختم ہونے والی تحریک پیدا ہوئی اور وہ شب و روز اسی مطالعے کے ہو کر رہ گئے۔ سینکڑوں کتب اسی ردی خانے سے لے کر پڑھ ڈالیں۔ یہی وجہ ہے کہ اوائل عمری میں ہی ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہو گیا۔ اس مطالعے سے ان کی سوچ کا محور یکسر بدل گیا ہے۔ ان کے سامنے علم و آگہی کے نئے نئے در وا ہوتے چلے گئے اور وہ دریافت کی نئی نئی منزلوں کی جانب گامزن ہو گئے۔

کلکتہ جہاں ادیب سہیل قیام پذیر تھے۔ اس گھر کا بالائی حصہ بہت کشادہ تھا۔ اس لیے ارد گرد رہنے والوں کی زندگی کا ایک نقشہ ان کے سامنے آ گیا۔ اس دور میں ان کی جن لوگوں کے ساتھ شبانہ روز ملاقات رہا کرتی تھی ان کا تذکرہ بھی اس سوانح میں نہایت عمدگی سے کیا گیا ہے۔ مزید براں ایسے لوگ جو شاعر سے متعارف تو نہ تھے لیکن ان کی ایک جھلک روزانہ شاعر کو دکھائی دیتی۔ ایسے افراد کے روزمرہ کے معمولات کی جھلک بھی ہمیں اس سوانح کے اندر نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے سب سے پہلے ایک ''مروالا'' کا تذکرہ کیا ہے جو نہایت بوڑھا تھا۔ سارا دن اسٹیشن کے کارک بناتا رہتا تھا۔ رات کو دیسی شراب پیتا اور پھر گاتا۔ اس کی جوان بیٹی ہر وقت اپنے محبوب کے لیے بے کل رہا کرتی تھی۔ شاعر کی بالائی منزل سے ذرا فاصلے پر ایک گھر کی ریلنگ پر ہمہ وقت ایک خوبصورت لڑکی کھڑی رہتی۔ یہ بڑی اداس اور خاموش طبع تھی۔ ریلنگ پر کھڑے ہو کر دوسروں کو گھورنا اس کا مشغلہ تھا۔ بہت کم لوگ اس لڑکی کے حالات سے واقف تھے۔ جب حقیقت کھلی تو پتہ چلا کہ یہ ایک بوڑھے کی تیسری بیوی ہے۔ اس طرح سوانح میں شاعر نے ایک کرسچین نژاد لڑکی کا خاکہ کھینچا ہے جو شاعر کی گلی سے تھوڑی دور رہتی تھی۔ اس کی چار بڑی بہنیں تھیں۔ ان کی بڑی بہنوں کے انگریز اور امریکی فوجیوں کے ساتھ مراسم تھے۔ لیکن یہ لڑکی ان برطانوی اور امریکی فوجیوں سے سخت نفرت کرتی تھی۔ یہ کرسچین نژاد لڑکی جہاں قیام پذیر تھی اس کے اوپر کے پورشن میں ایک ڈانس پارٹی رہا کرتی تھی جو فوجیوں کے لیے رقص و سرود کی محفلیں جمایا کرتی تھی۔ اس ڈانس پارٹی کے مرد اور عورتیں دن کو سوتے اور رات کو جاگتے۔ رات کو یہ تمام افراد چھت پر آ جاتے وہاں مرد ہلکی ہلکی ہوا کے دوش پر پتنگیں اڑاتے۔ عورتیں آپس میں ہنسی مذاق کرتیں۔ جب رات کی تاریکی پھیلنے لگتی تو ڈانس پارٹی کی عورتیں اور مرد ناچتے اور گاتے۔ شاعر اپنے گھر کے بالائی حصے سے یہ تمام مناظر دیکھتا۔ یہ مناظر اس کے حافظے میں محفوظ ہوتے چلے گئے۔ انہی مناظر کی جھلکیاں ہمیں اس سوانح میں نظر آتی ہیں۔

اس منظوم سوانح کی معنویت اس حوالے سے بھی ہے کہ اس میں جتنے بھی کردار آئے ہیں ان کا تعلق خواص سے نہیں بلکہ عوام سے ہے۔ ان کی زندگی بھی انہی المیوں اور محرومیوں سے عبارت ہے جو عام طبقے کا مقدر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کرداروں کے مطالعے سے ہمیں کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ یوں لگتا ہے جیسے یہ ہماری ہی سماجی اور تہذیبی زندگی کے مختلف شیڈز دکھا رہے ہیں۔ ان کرداروں کی جڑیں ہمیں اس دھرتی کے اندر پیوست نظر آتی ہیں۔ ان کی اول و آخر پہچان اور شناخت یہی دھرتی ہے۔ ان کا تعلق کسی بدیسی سیٹ اپ اور کلچر سے نہیں۔ یہ کردار کسی بھی سطح پر جمود اور ٹھہراؤ کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کے اندر تغیر اور تبدیلی کا رنگ چھپا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کرداروں کے حوالے سے ہم ایک عہد سے روشناس ہو جاتے ہیں۔ وہ عہد جو بدیسی حکمران کے تسلط کا ہے لیکن اس کے اندر آزادی کی تحریکیں تیزی سے پروان چڑھ رہی ہیں۔ ایک آویزش اور ٹکراؤ کی کیفیت ہے جو یہاں محکوم عوام اور مقتدر طبقوں کے درمیان تسلسل سے جاری ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں کلکتہ جس طرح بموں کی زد میں آ کر تباہی اور بربادی کا شکار ہوا اس کی کامیاب فوٹو گرافی کی گئی ہے۔ مزید براں بنگال میں آنے والے قحط سے لاکھوں لوگ جس طرح لقمہ اجل بنے ان مناظر کی جاندار تصویریں ہمیں اس منظوم سوانح میں ملتی ہیں۔ اس قحط کے مناظر کی جو تصویریں ادیب سہیل نے دکھائی ہیں وہ بڑی لرزہ خیز ہیں۔ خصوصاً وہ تصویریں جن میں لوگ بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں۔ ان کے بے گور و کفن لاشے چہار جانب پڑے ہیں کوئی اٹھانے والا نہیں۔ گھر گھر میں ہلاکتوں اور افلاس کا عذاب گھر آیا ہے۔ انگریز فوجی ان قحط زدہ انسانوں کی بے بسی پر قہقہے لگاتے اور محظوظ ہوتے۔ وہ بلند و بالا عمارت پر کھڑے ہو جاتے۔ اپنی جیبوں سے مٹھی بھر سکے نکالتے اور انہیں عورتوں کے ہجوم میں پھینک دیتے۔ قحط زدہ عورتیں اس سکوں کو لوٹنے کے لیے ٹوٹ پڑتیں۔ ایک بھگدڑ مچتی۔ اس بھگدڑ میں بہت سی عورتیں کچلی جاتیں۔ ان عورتوں کی بدحالی دیدنی ہوتی۔ ایک طرف بنگال میں لاکھوں لوگ بھوک سے مر رہے تھے جبکہ انگریز حکومت ہزاروں ٹن غلہ دریا برد کر رہی تھی تاکہ یہ غلہ آفت زدہ لوگوں کے کام نہ آ سکے اور حریت پسندوں کی تحریک کو کچلا جا سکے۔ اس منظوم سوانح میں ادیب سہیل ان تمام پہلوؤں کی جاندار تصویریں بنائی ہیں اور ان میں حقیقت کا رنگ بھرا ہے۔ اس ضمن میں ان کی اس منظوم سوانح سے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

شباب پر عالمی لڑائی تھی
ہر بڑا شہر اس کی زد میں
حریف بمبار سر پر منڈلاتے تھے
پروں میں بموں کو باندھے
زمین پر بھوک اور قحط کے
ناچتے تھے عفریت
موت ارزاں تھی
آگ اور خون کا کھیل جاری
ہمارے کلکتہ شہر کا عجب نقشہ تھا
سروں پر بمبار اڑ رہے تھے
اور قحط بنگال شاہراہوں پر
موت کے کھیل کھیلتا تھا
زمین پہ انسان
جیسے ہر لحہ اگ رہے تھے
تمام فٹ پاتھ تھے
فلاکت زدوں سے جل تھل
اور ایسا ناگفتہ بہ تھا عالم
کہ آدمی کے بدن کے تمام حصے بے جان
صرف آنکھوں میں دم
سو وہ بھی ہوں جیسے مہمان چند پل کے
کسی نے پس خوردہ پھینکا اوپر سے
تو گلی میں
لڑائی اور چھینا جھپٹی

مجھے ہے یاد ایسا منظر
زمانہ انیس سو تینتالیس عیسوی کا.....
اک کئی منزلہ عمارت
بھری کھچا کھچ تھی، یا نکی، فوجوں سے اس دم
یہ 'یانکی' جب ترنگ میں آتے
ان کو تفریح سوجھتی تو
وہ جیبوں سے
مٹھی بھر بھر کے سکے
اوپر سے پھینکتے تھے
کھڑی ہوئی نیچے
قحط کے جال میں پھنسی
عورتوں کی حالت
عجیب ہوتی تھی دیکھنے کی
زمیں پہ گرنے سے قبل پیسوں کو
لوٹنا چاہتی تھیں سب ہی
اور اس پر جو دھینگا مشتی مچتی تھی عورتوں میں
وہ فوجیوں کے لیے تلذذ کا اور تفریح کا تھا موقع!
گلے کی قوت سے غل مچاتے تھے
پے بہ پے پھینکتے تھے سکے
(غم زمانہ بھی سہل گزرا ص ۲۸، ۲۹)

حریت پسندوں اور کرانتی کاروں کی تحریک آزادی کو بھی اس منظوم سوانح میں فوکس کیا گیا ہے۔ یہ حریت پسند اور کرانتی کار ہر قیمت پر فرنگیوں کو ہندوستان سے باہر نکالنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے پورے انگریزی دور میں ان کے خلاف مسلح جدوجہد جاری رکھی۔ پابند سلاسل ہوئے، ہر طرح کے مصائب جھیلے اور صعوبتیں برداشت کیں۔ یہاں تک کہ مصلوب بھی ہوئے لیکن آزادی کی تحریک کو ماند نہیں پڑنے دیا۔ ان حریت پسندوں کی تحریک کا نتیجہ تھا کہ انگریز برصغیر پاک و ہند سے نکلنے پر مجبور ہوا۔ ادیب سہیل نے ان حریت پسندوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

تقسیم ہند کے سانحے کو بھی اس منظوم سوانح کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس سانحے نے صدیوں سے ساتھ ساتھ رہنے والے افراد کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ لاکھوں بے گناہ انسانوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ خصوصاً مسلمانوں کی کثیر تعداد جو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئی تھی ان کے گھر کے بیشتر افراد کو راستے میں قتل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کی طرح دوسرے مذاہب کے لوگ بھی قتل ہوئے۔ اس سانحے میں جتنے بھی لوگوں کا خون بہا وہ سب کے سب معصوم تھے۔ قطع نظر اس بات کے کہ ان کا تعلق کس مذہب یا فرقے سے تھا۔ ادیب سہیل نے اپنی اس منظوم سوانح میں نہایت بے لاگ انداز میں اس سانحے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور حقائق کو اجاگر کیا ہے۔

ہندوستان میں ادیب سہیل کے جن ہم عصر شعرا اور ادیبوں سے قریبی روابط رہے ان کا تذکرہ بھی اس سوانح میں آ گیا ہے اس طرح بعض قریبی دوستوں کے خاکے بھی کھینچے گئے ہیں جن کے ساتھ شاعر نے ایک طویل وقت بتایا۔ یہ خاکے بے حد جاندار ہیں۔ ان خاکوں کے تناظر میں ان شخصیات کے خدوخال سامنے آ گئے ہیں۔ کسی بھی شخصیت کے بارے میں ابتدائی معلومات درکار ہوں ان میں مل جائیں گی۔ گویا یہ خاکے ایک عہد کی دستاویز کا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔ جن احباب کے خاکے اس سوانح میں شامل ہیں ان میں علامہ عیش فیروز پوری، تاجور نجیب آبادی، جگر مرادآبادی، شکیل بدایونی، ناصر کاسگنجوی، فیاض احمد قمر قابل ذکر ہیں۔ مزید براں ان کرانتی کاروں کا ابتدائی تعارف درج کیا گیا ہے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی۔ ان میں ''سرجوسین''، ''کلپنادت'' اور ''سبھاش چندبوس'' قابل ذکر ہیں۔ مزید براں ان کرانتی کاروں کا ابتدائی تعارف درج کیا گیا ہے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی۔ اس طرح بعض تاریخی شخصیات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان شخصیات میں گیتی آراء اور قاضی شجاع نمایاں ہیں۔ سنگیت سے وابستہ جن رقاصاؤں کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے ان میں ''القاب'' اور ''مہتاب'' شامل ہیں۔ ان رقاصاؤں کے تعارف سے ادیب سہیل نے ہمیں سنگیت کے ایک عہد سے متعارف کروایا ہے۔ وہ عہد کے جس میں کلاسیکل گائیکی اپنے عروج پر تھی۔ گانے والے راگ اور راگنیوں کے اسرار و رموز سے واقف تھے۔ اس کے گاتے ہوئے ایک سماں باندھ دیتے تھے۔ ''القاب'' اور ''مہتاب'' سنگیت کی دنیا کی اہم علامتیں ہیں۔ ان کے حوالے سے اس موسیقی اور رقص و سرود کے کلچر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس دور میں برصغیر کے اندر پنپ رہا تھا۔ اس کلچر سے مختلف مکتب فکر کے لوگ وابستہ تھے۔ بدیسی سیٹ اپ کے ظلم و ستم کے برعکس اس کلچر اور سیٹ اپ کے اندر راحت کا سامان تھا۔ اس لیے اس کلچر کو حد درجہ فروغ حاصل ہوا۔ ادیب سہیل نے اپنی سوانح میں اس کلچر کی متعدد جہتوں کو موضوع بنایا ہے۔ سُر اور سنگیت کی دنیا اپنے اندر کیسے کیسے اسرار و رموز لیے ہوئے ہے اس کا خاکہ اس سوانح کے اندر کھینچا گیا ہے۔

اس سوانح کا مطالعہ ہمارے سامنے ادیب سہیل کی فکر کے نئے نئے در وا کرتا ہے اور ہمیں ایک گزرے ہوئے عہد سے روشناس کراتا ہے۔ وہ عہد جو بیت گیا لیکن اپنے نقوش چھوڑ گیا۔ آج یہ عہد ہمارے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔ تاریخ کی وہ سچائیاں جن کو اس دور میں مقتدر قوتوں نے ابھرنے نہیں دیا تھا آج وہ اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ واضح ہو گئی ہیں۔ انہیں نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے نظریں چرائی جا سکتی ہیں۔ یہ سوانح انہی سچائیوں سے عبارت ہے۔

اس منظوم سوانح کے تناظر میں ہم ایک ایسے ادیب سہیل سے متعارف ہوتے ہیں جو تعصب سے بالا اور وسیع المشرب ہے۔ جو بلا تخصیص مذہب و ملت تمام انسانوں سے یکساں پیار کرتا ہے۔ وہ ہر اس سوچ اور نظریے کا مخالف ہے جو انسانوں کو تقسیم کرتا ہے اور ان کے درمیان نفرت کی دیواریں کھڑی کرتا ہے اور نت نئے المیوں اور نفرتوں کو جنم دیتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے اشعار میں انسانی بھائی چارے اور رواداری کا درس دیتے ہیں۔ کیونکہ رواداری اور انسانی بھائی چارے سے تعصب اور نفرت کے تمام

نظریات کو باطل کیا جا سکتا ہے اور معاشرے کو راحت اور سکون کا گہوارہ بنایا جا سکتا ہے۔

ادیب سہیل کی اس منظوم سوانح کی خصوصیت اس حوالے سے بھی ہے کہ اس کی جڑیں برصغیر کی دھرتی کے اندر پیوست نظر آتی ہیں۔ کہیں بھی بدیسی فضا غالب نظر نہیں آتی۔ سارے کے سارے کردار مقامی سیٹ اپ سے جڑے ہوئے اور اس کی متعدد جہتوں کے ترجمان ہیں۔ جو مناظر دکھائے گئے ہیں وہ بھی سب کے سب ہماری معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے ہیں۔ کہیں بھی غیریت کا احساس جنم نہیں لیتا۔

یہ منظوم سوانح لسانی حوالے سے بھی ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ادیب سہیل وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کے حالات کو منظوم شکل میں پیش کیا ہے۔ عہد جدید کے شعرا یقیناً اس تجربے سے استفادہ کریں گے۔ یہ تجربہ نئے رجحانات کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

آگرہ میں اردو صحافت

آغاز اور آزادی کے بعد

ڈاکٹر سید اختیار جعفری (آگرہ)

صحافت کے قطرے کو ''گہر'' ہونے تک بڑے جاں کسل حالات سے گزرنا پڑا ہے۔ دنیا میں صحافت کا پتہ ۲۱۷ سال قبل مسیح تک چلتا ہے۔ تاریخ صحافت بتاتی ہے کہ روی شہنشاہ جولیس سیزر نے سب سے پہلے اس کی ضرورت محسوس کی۔ اس نے ۲۱۷ ق م میں ایک قلمی دیواری پرچہ جاری کیا۔ جس میں اعلانات کے علاوہ سرکاری خبریں، نئے قوانین، سرکاری منصوبہ بندی، سرحد کی جنگی خبریں اور ساتھ ہی انتظامیہ سے متعلق خبریں بھی درج کی جاتی تھیں[۱]۔ مطبوعہ صحافت کا آغاز اس کے تقریباً سوا دو ہزار سال بعد ہوا۔ ۱۶۰۹ء میں پریس کی ایجاد کے بعد صحافت میں بھی انقلاب آیا۔ ہندوستان میں سب سے پہلا باقاعدہ اخبار کمپنی سرکار کے ملازم جیمس آگسٹس ہکی نے ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو ''کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر'' کے نام سے کلکتہ سے جاری کیا[۲]۔ برصغیر میں اردو صحافت کی ابتدا ہفت روزہ اخباروں سے ہوئی۔ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے ہی اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' شائع ہوا[۳]۔ ۱۸۲۵ء میں جب لیتھوگرافی شروع ہوئی تو دہلی، لکھنو، مدراس، کلکتہ اور بمبئی سے بھی اردو اخبارات کی اشاعت شروع ہوگئی۔ چونکہ سرکاری زبان فارسی سے بدل کر اردو کر دی گئی تھی، اس لیے ظاہر ہے کہ اردو اخبارات و رسائل کی ترویج میں عوام کے ساتھ حکومت نے بھی حصہ لیا۔

آگرہ قدیم ترین دور سے ہی بہت اہم شہر رہا ہے۔ لودھی سلاطین کے بعد یہ شہر سلطنت مغلیہ کا دارالسلطنت بنایا گیا۔ اس کے بعد یہ شہر ترقی و شہرت کی بلندیوں تک پہنچا۔ آگرہ میں صحافت کی تاریخ تقریباً پونے دو سو سال پرانی ہے[۴]۔ اس طویل عرصے میں آگرہ کی صحافت پورے ملک میں قدر و منزلت کے ساتھ دیکھی جاتی رہی ہے۔ ۱۸۲۰ء سے ۱۸۳۰ء تک کان پور، میرٹھ اور آگرہ میں تقریباً نصف درجن چھاپے خانے قائم ہوئے۔ آگرہ میں جو چھاپا خانہ قائم ہوا اس کے مالک ڈاکٹر جان ہنڈرسن تھے۔ اس مطبع کا نام ''مطبع آگرہ اخبار'' تھا۔ ڈاکٹر ہنڈرسن نے اسی مطبع سے ''آگرہ اخبار'' کے نام سے ۱۸۳۲ء میں ایک اخبار بھی جاری کیا[۵]۔ یہ اخبار دیسی زبان کا اخبار فارسی رسم الخط میں تھا۔ داوین میں جو جملہ لکھا گیا ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ اردو اخبار رہا ہوگا۔ لیکن ہنڈرسن نے اپنی درخواستوں میں، جو نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہیں، اس کو فارسی اخبار (پرشین نیوز پے پر) لکھا ہے۔ اس اخبار میں خبروں سے زیادہ عدالتی اور خاص طور پر فوج داری عدالتوں کی صحیح کارروائیاں شائع کی جاتی تھیں۔ چند مہینوں تک اخبار نکالنے کے بعد مسٹر ہنڈرسن اس نتیجے پر پہنچے کہ فارسی اخبار کامیاب نہ ہوگا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ شعر و شاعری اور داستان امیر حمزہ کے عاشق ایسی روکھی پھیکی زبان پڑھنے کی طرف راغب ہی نہ تھے۔ پھر ایک انگریز کی کاوشیں ہندوستانی عوام کو پسند آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ چوتھا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک اردو یا فارسی کم از کم اخبار کی زبان بننے کے لائق نہیں ہو سکی تھیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنڈرسن نے آگرہ اخبار کو نومبر ۱۸۳۲ء میں فارسی سے انگریزی کا اخبار بنا دیا۔ لیکن اخبار کا نام تبدیل کرنا انہوں نے ضروری نہیں

سمجھا اور انگریزی اخبار کا نام بھی ''آگرہ اخبار'' ہی رہا۔ اس کے کچھ نمبر انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں محفوظ ہیں۔[۶]

دسمبر ۱۸۳۲ء میں ڈاکٹر ہنڈرسن نے آگرہ اخبار انگریزی میں نکالنا شروع کر دیا تھا۔ ابتداً اخبار کی ظاہری شکل اور اٹھان اچھی نہ تھی مگر کچھ دنوں بعد ہنڈرسن نے یہ اخبار اور مطبع مسٹر ہنری ٹانڈے کے سپرد کر دیا۔ ہنری ٹانڈے نے ایڈیٹر بننے کے بعد اخبار کی ظاہری و معنوی شکل وصورت بدل دی تو اخبار مقبول ہونے لگا۔ اس کا شمار جلد ہی شمال کے اچھے انگریزی اخبارات میں ہونے لگا لیکن ۱۸۴۰ء میں ہنری ٹانڈے کی وفات کے بعد اخبار پھر گرنے لگا۔ یکے بعد دیگرے ان کے دو اعزہ اے سانڈرس اور پی سانڈرس آگرہ اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے مگر وہ دونوں بھی جلد ہی اس دنیا سے سدھار گئے۔ بالآخر چھاپہ خانہ بک گیا اور آگرہ اخبار بند ہو گیا۔ پھر کچھ دنوں بعد اسی مطبع آگرہ اخبار سے آگرہ کرانیکل طبع ہو کر شائع ہوا۔ جو تھوڑے دنوں تک نکلتا رہا۔ آگے چل کر ''دہلی گزٹ'' کے مالکوں نے اس چھاپہ خانے کو خرید لیا۔[۷]

صحافت کی عام تاریخ کے مطابق آگرہ سے بھی پہلے مطبوعہ اخبار فارسی میں ہی طبع ہوئے بعد میں اردو اخباروں کا چلن ہوا۔ شمالی ہند کا پہلا اخبار مسٹر ہنڈرسن نے ''آگرہ اخبار'' کے نام سے جاری کیا تھا۔ جب زبدۃ الاخبار شروع ہوا ہوگا، یہ اخبار یقیناً بند ہو گیا ہوگا۔ شروع میں زبدۃ الاخبار کا اپنا پریس نہیں تھا۔ یہ آگرہ اخبار پریس (ہنڈرسن پریس) میں ہی چھپتا تھا۔

اب یہاں اردو صحافت کے نام پر ایک دو ورقی ہفت روزہ کے علاوہ کچھ نہیں، لیکن ماضی میں اردو صحافت کا دور ہی صحافت کی اعلیٰ روشن مثال تصور کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں کی اردو صحافت علاقے کے عوام، سرکاری مشینری اور خود صحافی حلقوں میں ممتاز اور جارحانہ تیوروں کے لیے معروف رہی ہے۔ آگرہ کی اردو صحافت نے اپنے یوم پیدائش سے ہی ملک وقوم کو بیدار کرنے، ملی و علاقائی مسائل کو اٹھانے اور ان کی طرف سرکار و عوام دونوں کو متوجہ کرنے کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا۔ انگریزوں کے خلاف مورچہ کھول کر ان صحافیوں اور اخباروں نے نہ صرف حکومت کے ذمہ داروں کی نیندیں حرام کر دیں بلکہ عوام کی رہنمائی اور ان کی اصلاح کے فرائض بھی انجام دیئے جس کی وجہ سے عام حالات کے مطابق ہی دار و رسن ان کا مقدر بن گئیں۔ انیسویں صدی پوری طرح اور بیسویں صدی کا نصف اول اردو صدی کے نام سے معروف ہے۔ خال خال اخباروں کو چھوڑ کر اس وقت کے تمام اہم اخبارات و رسائل اردو زبان ہی میں نکلتے تھے۔ ان اخبارات و رسائل نے اردو زبان و ادب کی ترویج میں اہم رول ادا کیا۔ آگرہ میں اردو کے فروغ وارتقاء کی تاریخ میں ان کا اہم حصہ ہے۔ اس لیے یہاں سے شائع ہونے والے اردو اخبارات و رسائل کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

زبدۃ الاخبار:

آگرہ میں صحافت کی تاریخ ۱۸۳۳ء سے شروع ہوتی ہے[۵]۔ جب صحافت کی بنیاد رکھنے والا پہلا اخبار ''زبدۃ الاخبار'' واجد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہوا۔ اردو زبان کے بجائے یہ فارسی میں چھپتا تھا۔ چار صفحے کے اس اخبار کی قیمت ماہانہ ایک روپیہ تھی۔ یہ ہفت روزہ اخبار جمعہ کے دن شائع ہوتا تھا۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر منشی واجد علی خاں فارسی زبان و ادب پر عبور رکھتے تھے۔ فارسی انشاء پردازی اور مختلف زبانوں سے فارسی میں ترجمہ کرنے میں انھیں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ وہ لگاتار پندرہ سال اخبار کے مہتمم رہے اور ۱۸۴۶ء سے یہ اخبار ان کی ملکیت میں بھی آ گیا۔ اختر الدولہ حاجی منشی محمد اشرف نے اپنی تالیف ''اختر شاہنشہی'' میں اس اخبار کا اجراء ۱۸۵۳ء میں دکھایا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں ''زبدۃ الاخبار آگرہ، ہفتہ وار، چار ورق، اجرا ۸۱ نومبر ۱۸۵۳ء۔[۸] لیکن انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ نے ۱۹۶۲ء میں ''صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ۱۸۵۳۔۱۸۴۸ء'' کی انگریزی دستاویز کا جو ترجمہ شائع کیا ہے اس میں عتیق صدیقی نے اس کا سال اجرا ۱۸۳۳ء قرار دیا ہے اور ۱۸۵۳ء کی سنہ کو رد کر دیا ہے۔ کیونکہ رپورٹ کے انگریز مرتب پی سی اسمتھ اسسٹنٹ سیکرٹری حکومت شمالی و مغربی نے ۱۸۴۸ء کی اپنی سرکاری رپورٹ میں لکھا ہے کہ منشی واجد علی خاں گزشتہ پندرہ سال سے اس اخبار کے مہتمم ہیں اور اب پچھلے دو برس سے وہی اس کے مالک بھی ہیں۔ اس اعتبار سے زبدۃ الاخبار ۱۸۳۳ء میں جاری ہونا صحیح لگتا ہے۔ جیسا کہ امداد صابری صاحب کا بھی خیال ہے۔[۹]

اس وقت اخبار کا سرکولیشن سب سے زیادہ تھا۔ اخبار سے مالک کو ۱۴۰ روپیہ ماہانہ کی آمدنی تھی۔ عوام کے علاوہ خواص بھی اس سے متاثر تھے۔ راجہ، مہاراجہ اور نواب الگ سے اس کی اعانت کرتے تھے۔ ان کو یہ بھی خوف رہتا تھا کہ کہیں یہ اخبار ان کے خلاف کچھ شائع نہ کر دے۔ اس لیے وہ ان کا خیال رکھتے تھے۔ ۱۸۴۸ء میں اس مد میں اخبار کو راجہ بھرت پور سے ۳۰ روپیہ ماہانہ، راجہ الور سے ۲۰ روپیہ ماہانہ، نواب جھجر سے ۱۵ روپیہ ماہانہ، نواب جاورا سے ۱۰ روپیہ ماہانہ، نظام حیدر آباد سے ۱۵ روپیہ کل ۱۰۵ روپیہ ماہانہ آمدنی ہوئی تھی۔ اس وقت اگر اخبار کا ماہانہ کل خرچ زیادہ سے زیادہ ۴۰ روپیہ بھی مان لیا جائے تو اخبار ایک سو روپے نقد منافع میں چل رہا تھا۔ اخبار کے مواد کے سلسلے میں انگریز مرتب لکھتا ہے:

> ''زبدۃ الاخبار کی خبریں عموماً مصدقہ ہوتی ہیں، جو انگریزی اخباروں سے یا دیگر معتبر ذرائع سے حاصل کی جاتی ہیں۔ ایڈیٹر کسی معاملے میں عموماً نہ تو اپنی رائے ظاہر کرتا ہے اور نہ کوئی قابل گرفت بات ہی لکھتا ہے۔ وہ حد درجہ احتیاط برتتا ہے۔ بے اطمینانی کے اظہار کی اگر کبھی نوبت بھی آتی ہے تو وہ اپنے خیالات کو رنگین عبارت کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ فحش نگاری سے اس کو دور دور کا واسطہ نہیں''۔[۱۰]

اورینٹل: آگرہ سے شائع ہونے والا اردو کا یہ پہلا اخبار ہے۔ اس کا اجراء ۱۸۴۵ء میں ہوا۔ اس کے ایڈیٹر اور مالک لالہ میگھ راج تھے جو مدرسہ آگرہ (آگرہ کالج) میں فارسی کے استاد تھے۔ یہ پندرہ روزہ اخبار تھا۔ پہلے اس کی طباعت مطبع زبدۃ الاخبار میں ہوتی تھی۔ لیکن بعد میں لالہ میگھ راج نے اورینٹل میگزین پریس کے نام سے اپنا ذاتی طبع قائم کر لیا۔ یہ مطبع محلہ صابون کٹرہ میں تھا اور یہیں اخبار کا دفتر بھی تھا۔ اس اخبار کی زیادہ تفصیلات فراہم نہ ہو سکیں۔ نواب حاجی محمد اشرف، امداد صابری، نادر علی خاں اور محمد عتیق صدیقی نے اس کا کوئی خاص ذکر نہیں کیا۔ لیکن آگرہ کی اردو صحافت کے بابائے آدم کے طور پر اس کا تذکرہ مفتی انتظام اللہ شہابی نے ''آگرہ کی ادبی تاریخ صحافت'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔

اسعد الاخبار: ۷ مئی ۱۸۴۷ء مطابق جمادی الآخر ۱۲۶۳ھ اور یہ اخبار آگرہ سے شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ دو ورقی ہفت روزہ اخبار تھا۔ اخبار کے نام کی مناسبت سے اس کے مطبع کا نام بھی ''مطبع اسعد الاخبار'' تھا۔ اخبار کے مہتمم (مالک) مولوی قمر الدین خاں تھے جو ایک بے حد راسخ العقیدہ سنی حنفی مسلمان تھے۔ علم حدیث اور تاریخ اسلام پر ان کو عبور تھا۔ انھیں شعر گوئی سے بھی مناسبت تھی۔ اسعد الاخبار میں ان کی بعض فارسی غزلیں بتاتی ہیں کہ وہ ایک قادر الکلام فارسی شاعر تھے۔ ان کی نثر سادہ، سلیس اور بامحاورہ ہوتی تھی۔ اس دور کے زیادہ تر اخبارات و رسائل ہی کی طرح اس اخبار کے بارے میں بھی ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ سرکاری رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس اخبار میں عام خبروں کے علاوہ زیادہ تر مذہبی مضامین ہی شائع ہوتے تھے۔ عوام پر اس کا کچھ خاص اثر نہیں تھا۔ اس کے چار صفحے ہوتے تھے، تین میں قابل ذکر مسلمانوں، علماء، فضلاء اور خلفاء و اولیاء وغیرہ کا تذکرہ ہوتا اور صرف ایک صفحہ میں چند مقامی خبریں ہوتی تھیں۔ لہٰذا اس کو خریدنے اور پڑھنے والا ایک محدود طبقہ تھا۔ ۱۹۴۸ء کی سرکاری رپورٹ کے مطابق اس کی تعداد اشاعت ۵۲ کاپیاں تھیں۔ خریداروں میں ۴۸ مسلمان اور ۴ ہندو تھے۔ اس کا چندہ ۸ ماہ پیشگی لیا

جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے کوئی خاص آمدنی نہیں ہوتی تھی۔ منشی قمرالدین خاں کی آمدنی کا ذریعہ کتابوں کی طباعت تھی جو ان کے مطبع سے چھپتی تھیں۔ ۱۸۴۹ء میں اس کی تعداد اشاعت میں اضافہ ہوا اور یہ تعداد ۵۲ سے بڑھ کر ۱۲۰ اور ۱۸۵۰ء میں ۱۲۵ ہوگئی۔ ۱۸۵۱ء میں اسی مطبع سے قمرالدین خان نے ہی ایک پندرہ روزہ ''معیارالشعراء'' بھی نکالنا شروع کیا۔ دوسری طرف اسعدالاخبار کی اشاعت گھٹ کر ۱۷۱ رہ گئی۔ حالانکہ اخبار کے مواد، انتخاب مضامین اور معیار میں کوئی کمی نہیں آئی مگر اس کی اشاعت لگاتار گرتی چلی گئی۔ جو طبقہ اس اخبار کا شائق تھا اس کے اعتبار سے اس اخبار کے طرز تحریر، خبروں کی نوعیت اور ترتیب مضامین میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی مگر حیرت انگیز طور پر ۱۸۵۴ء میں اس کی تعداد اشاعت بہت کم ہو کر صرف ۴۶ رہ گئی اور پھر بہت جلد بند ہو گیا[9]۔ اس کی قیمت آٹھ آنے ماہوار علاوہ محصول ڈاک تھی۔ اس دور کے اور اخباروں کی طرح یہ اخبار بھی صاحب مطبع کا تھا۔ ۱۸۴۹ء میں اسی مطبع سے تفتہ کے دیوان کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ کیفی صاحب مرحوم کی نظر سے اس اخبار کی ایک فائل گزری تھی۔ ان کے بیان کے مطابق ۲۰ نومبر ۱۸۴۸ء کی اشاعت میں مرزا حاتم علی مہرؔ اکبرآبادی کا یہ قطعہ تاریخ درج ہے، جو انھوں نے لارڈ ڈلہوزی کے خیر مقدم میں کہا تھا:

لارڈ ڈلہوز است رونق بخش ہند — اے صبا در شش جہت ایں مژدہ گو
مصر تاریخ مقدم گفت مہرؔ — افتخار ہند بادا نجم تو

۲ مارچ ۱۸۴۹ء کی اشاعت میں مرزا غالبؔ کی پنج آہنگ کا اشتہار ایک لمبی نظم میں درج ہے۔ یہ کتاب شاہی طبیب حکیم احسن اللہ کے توسل سے قلعہ دہلی کے مطبع سلطانی میں چھپی تھی۔

مرزا غالبؔ کے سلسلے کی ایک خبر سنیے۔ ۱۵ جولائی ۱۸۵۰ء کے اسعدالاخبار سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ:

''ان دنوں شاہ دین پناہ نے جناب معلّی القاب مرزا اسداللہ غالبؔ کو بہ فرط عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانہ سے سلطنت حال تک ہو مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپے مشاہرہ مقرر کر کے آئندہ انواع پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ دبیرالملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب دے کر چھ پارچہ کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تواریخ مذکورہ ایسی دل چسپ ہوگی کہ ہر ایک اس کے لطفِ عبارت سے فیضیاب ہو گا''۔[11]

اسعدالاخبار نیم سیاسی و نیم علمی قسم کا پرچہ تھا۔ اس میں نثری مضامین کے علاوہ شعراء کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ یہ کلام زیادہ تر فارسی میں ہوتا تھا۔ مئی ۱۸۴۸ء لغایت اکتوبر ۱۸۵۲ء کے فائل میں درج ذیل اساتذہ کے کلام سے صفحات مزین ہیں۔

منشی نبی بخش حقیرؔ (فارسی غزل)، سید کاظم علی کاظمؔ اکبرآبادی (فارسی)، مدد علی تپشؔ اکبرآبادی (فارسی)، قاضی محمد قاسم ناظرؔ جہان آبادی، (۳ رغزلیں فارسی)، منشی درگا پرشاد نشاط سکندرآبادی (۲ رغزلیں فارسی)، منشی واجد علی خاں واجدؔ مہتمم زبدۃ الاخبار (۳ رغزلیں فارسی)، سید حسین شاہ واصفؔ (فارسی)، شیر علی خاں مرادآبادی (۳ رغزلیں فارسی)، شاہ غلام اعظم (اردو نعت)، بابو لال ذاکرؔ (اردو نعت)، حافظ بلاقیؔ اکبرآبادی (غزل فارسی)، عبدالرحمن انصافؔ اکبرآبادی (اردو غزل)، حکیم حسین صاحب علوی (اردو غزل)۔

آگرہ میں صحافت آزادی کے بعد:

صدائے قریش: حالانکہ اس اخبار کا نام ایک قبیلہ خاص پر تھا لیکن یہ آگرہ کا عوامی اخبار تھا۔ یہ ماہانہ اخبار ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر غلام رسول چواری نے گھٹیہ ماموں بھانجہ سے شروع کیا۔ اس میں قریش برادری کی خبروں کو اہمیت کے ساتھ چھاپا جاتا تھا۔

احساس: آزادی کے بعد پورے ملک میں افراتفری کا جو دور شروع ہوا تھا اس کا اثر آگرہ پر کچھ زیادہ ہی تھا۔ ویسے بھی آگرہ کی زمین کو علم و ادب کا سنگلاخ میدان کہا جاتا رہا ہے۔ تاہم یہ خلا زیادہ دیر تک جاری نہیں رہا۔ اردو اخبار کی ضرورت کا احساس سب سے پہلے غلام رسول چواری کو ہوا اور انہوں نے ۱۹۵۲ء میں احساس نکالنا شروع کیا۔ یہ چار صفحے کا اخبار تھا۔ تیسرے صفحے پر عام طور سے دینی مسائل، قومی مسائل، اور حالات حاضرہ پر مشہور صحافیوں اور مضمون نگاروں کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ ایڈیٹوریل نوٹ جس میں ملکی حالات اور ملی مسائل کا تجزیہ ہوتا تھا، اسی صفحہ پر شائع ہوتا تھا۔ شعرائے اکبرآباد میں سے بعض کی غزلیں، ادبی و لسانی مضامین، مذہبی مباحث بھی درج کیے جاتے تھے۔ اخبار کی قیمت ایک روپیہ تھی۔ پہلے صفحہ کا نچلا ایک چوتھائی حصہ آگرہ کی اہم ترین خبروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ آخری صفحہ پر عام قسم کی خبریں ہوتی تھیں۔ اخبار کے پرنٹر، پبلشر، مالک اور ایڈیٹر خود ڈاکٹر غلام رسول چواری ہی تھے۔ آپ ۱۹۷۹ء میں نیشنل اسمال جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے صدر اور آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے ممبر استقبالیہ کمیٹی رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی موت ۱۵ جولائی ۱۹۸۶ء کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔

شبستان: یہ ماہانہ رسالہ آگرہ سے ۱۹۵۲ء میں شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر کشور انیس بجنوری تھے۔ یہ ایک ادبی رسالہ تھا جس میں نثری مضامین کے علاوہ مقتدر شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا۔ ملک فتح پوری، محترمہ شاہین بیدم الہ آبادی، حباب ترمذی اور ہارون حباب وغیرہ کا خصوصی قلمی تعاون شامل تھا۔ ۱۹۵۲ء کے اواخر میں شروع ہوا تھا ۲/۳ شمارہ شائع ہونے کے بعد ۱۹۵۳ء میں پوری طرح اس کی ادارتی ذمہ داری عمر تیموری نے سنبھال لی۔ اپریل ۱۹۵۴ء میں ۱۱/شمارہ شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ مشہور جنتری پریس آگرہ میں طباعت ہوتی تھی۔

شبستان کے دوسرے ایڈیٹر جناب عمر تیموری ابھی بھی بحمداللہ حیات ہیں۔ ایک ملاقات میں انہوں نے راقم الحروف کو بتایا کہ اس رسالہ کے شمارہ نمبر ۶ میں ایک ادبی بحث ''آگرہ بحیثیت ادبی دبستان'' کو لے کر ہوئی تھی۔ جس پر دوسرے معاصر رسائل نے بھی کافی تبصرے کیے تھے۔ لیکن کہن سالگی کے سبب وہ شبستان کے مندرجات کی تفصیل نہ بتا سکے۔ جناب عمر تیموری ۱۷ فروری ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ مڈل ۱۹۴۸ء، ہائی اسکول ۱۹۵۱ء، انٹرمیڈیٹ ۱۹۵۳ء میں پاس کیا۔ بی اے ۱۹۵۵ء میں مہاراشٹر کے ایک اوپن بورڈ سے مراسلاتی نظام تعلیم کے ذریعہ پاس کیا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ سب سے پہلے انہوں نے ۱۹۴۸ء میں ایک غزل کہی جو ممبئی کے کسی رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک انہوں نے روزنامہ تیج، ملاپ وغیرہ کے فلمی سیکشن میں کام کیا۔ ۵۲۔۱۹۵۰ء تک وہ فلمی میگزین شوبھانی، نئی لکیر دہلی اور شمع دہلی وغیرہ میں ملازمت کرتے رہے۔ شمع سے انہیں ۱۵ روپیہ مشاہرہ ملتا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں آریہ ورت روزنامہ میں کام کیا۔

ممبئی سے دہلی ہوتے ہوئے وہ ۱۹۵۳ء کے اواخر میں آگرہ آ گئے۔ جہاں کشور انیس بجنوری ۱۹۵۲ء میں شبستان نکال چکے تھے لیکن گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے وہ اسے صحیح ڈھنگ سے نہیں چلا پا رہے تھے۔ ۱۹۵۳ء کے اوائل میں انہوں نے اس کی ذمہ داری باقاعدہ جناب عمر تیموری کے سپرد کر دی۔ لیکن مالی وسائل کے نہ ہونے سے یہ رسالہ بہت جلد بند ہو گیا۔ اس کے بعد عمر

تیموری نے مندرجہ ذیل اخبارات ورسائل نکالے۔

تاج اردو: یہ آگرہ کا دوسرا اردو روزنامہ تھا پہلا اردو روزنامہ شمشاد حسین صدیقی منظر صاحبزادہ سیماب اکبرآبادی نے ۱۹۳۰ء یا اس کے آس پاس ہی ''ایشیا'' کے نام سے نکالا تھا۔ روزنامہ تاج اردو اپریل ۱۹۵۵ء میں جاری ہوا۔ اس کے پرنٹر و پبلشر سید ذوالفقار تھے جو اس اخبار کے پارٹنر بھی تھے۔ مشہور جنتری پریس آگرہ میں طباعت ہوتی تھی۔ لیکن آگرہ میں کاتبوں کے فقدان، رپورٹرز کی عدم دستیابی اور اپنا پریس نہ ہونے کے سبب محض ۳ ماہ بعد اسے بند کرنا پڑا۔ عمر تیموری اس کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ بعض مرتبہ خود ہی اس کی خبریں جمع کر کے لانا پڑتی تھیں۔ خود ہی کتابت بھی کئی مرتبہ کی۔ انہوں نے خود ہی ہاکری کرتے ہوئے اخبار چلانے کی پوری کوشش کی مگر آگرہ کی سنگلاخ زمین ایک اردو روزنامہ زیادہ دن تک نہیں برداشت کر پائی۔

ساقی: یہ ادبی ماہنامہ ۱۹۵۶ء میں شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر عمر تیموری تھے۔ رسالہ 18x4 سائز میں مشہور جنتری پریس آگرہ میں چھپتا تھا۔ صفحات کی تعداد ۶۴۔ شمس کنول، جلال مراد آبادی، اختر الایمان، سلمیٰ صدیقی اور عالم فتح پوری وغیرہ اس کے پہلے شمارے کے قلم کار تھے۔ اس کے باوجود ایک ہی شمارہ شائع ہو سکا اور یہ بند ہو گیا۔

مقبول: عمر تیموری نے ''مقبول'' نام سے ہفتہ وار اخبار اپریل ۱۹۵۶ء میں نکالنا شروع کیا۔ یہ ان کا چوتھا صحافتی سنگ میل تھا۔ مشہور جنتری پریس کے مالک اور کاتب منشی ظہور الدین اس اخبار کے پرنٹر پبلشر تھے۔ اسی پریس سے یہ طبع بھی ہوتا تھا۔ لیکن پرنٹ لائن میں، پریس کا نام مصطفائی پریس دیا جاتا تھا۔ اس اخبار کے صرف ۳ شمارے نکلے۔ اس کے ۴ صفحے ہوتے تھے۔

قومی وقار: یہ اخبار ہفت روزہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر سہارن پور سے آگرہ آ کر بس گئے خالد عثمانی تھے۔ خالد عثمانی کٹر کانگریسی تھے۔ یہ اخبار ''آگرہ اخبار پریس'' میں طبع ہوتا تھا۔ ۴ صفحات تھے۔ عمر تیموری صاحب اس کے ادارتی اسٹاف میں شامل تھے۔ ۱۹۵۷ء میں اجرا ہوا۔

تاج ور: یہ ایک ہفت روزہ اخبار ہے جو عمر تیموری صاحب نے فروری ۱۹۷۴ء میں آگرہ سے جاری کیا۔ یہ اخبار ان کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ۱۹۷۴ء سے ۲۸ سال بعد یعنی ۲۰۰۳ء میں بھی جاری ہے۔ قیمت فی پرچہ ایک روپیہ، ششماہی ۳۰ روپیہ، لائف ممبر اکیس سو روپیہ اور خصوصی معاونین سے زر سالانہ پانچ سو روپیہ مقرر ہے۔ جلد ۲۹ شمارہ نمبر ۲۴ مورخہ ۲۸ جون سے ۷ جولائی ۲۰۰۲ء کے مطابق اس اخبار کو حکومت یوپی اور مرکزی حکومت کے شعبہ اطلاعات و نشریات (DAVP) سے سرکاری اشتہارات کے لیے منظوری حاصل ہے۔ اخبار کے پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر اور پروپرائٹر پیرزادہ عمر تیموری ہیں۔ طباعت تاجور پریس تاج گنج آگرہ میں ہوتی ہے۔ اخبار کا دفتر تیموری ہاؤس، تانگہ اسٹینڈ کے نزدیک نظیر مارگ تاج گنج آگرہ میں ہے۔ ۴ صفحہ کے اس اخبار میں ۴ ہی خبریں ہیں۔ ایک طویل افسانہ یا ناول بھی اس میں قسط وار چھپ رہا ہے جس کا عنوان ''ایک مٹھی خاک'' ہے۔ لیکن ترتیب وتہذیب ملاحظہ فرمایئے کہ نہ تو اس پر قسط نمبر چھپی ہے اور نہ مصنف کا نام۔ عموماً اس اخبار کا یہی حال ہے۔ عمر تیموری صاحب چونکہ خاصے ضعیف ہو چکے ہیں اور قلمی و مالی تعاون بھی نہیں ہے اس لیے اب اخبار کی طرف توجہ کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اخبار میں قاری کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ نہ کوئی خاص مضمون اور نہ کوئی ڈھنگ کی خبر۔ ایڈیٹوریل بھی یونہی سا ہوتا ہے۔ اخبار کی کمپوزنگ کمپیوٹر سے ہوتی ہے۔

تاج ور اردو ہفت روزہ کے ساتھ ہی اس کا ہندی ایڈیشن ٹائمس آف تاجور کے نام سے بھی ہفت روزہ کی شکل میں عمر تیموری شائع کرتے ہیں۔ دونوں اخبار اسی وقت چھپ پاتے ہیں جب ایڈیٹر کے پاس اتنی رقم ہو جاتی ہے۔ کل ملا کر دونوں اخبار غیر ذمہ داری اور اہل آگرہ کی بے حسی کا شکار ہیں۔

پیرزادہ عمر تیموری نے مندرجہ بالا ۱۷ اخبار نکالنے کے علاوہ ایک مختصر کتاب اردو زبان میں سیدنا سرکار بھی لکھی ہے۔ اس مختصر کتاب میں جہانگیری عہد کے بزرگ سیدنا امیر ابوالعلاء احراری نقشبندی اکبرآبادی کے مختصر سوانح اور چند متفرق واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

صحیح آواز: مرزا شمیم بیگ پیشہ سے وکیل، دماغ سے مفکر، قلم سے صحافی اور روح سے پاک طینت شخص ہیں۔ اردو، ہندی اور انگریزی صحافت میں دھاردار قلم کے لیے ان کی الگ شناخت ہے۔ انہوں نے ایک پندرہ روزہ اخبار ۱۹۷۶ء میں نکالا۔ اس ہندی نما اردو اخبار کا نام ''صحیح آواز'' تھا۔ ۲۴ گو کہ اس کے بانی ایڈیٹر سعید الدین (کشمیری بازار) تھے لیکن ۲۴ ستمبر ۱۹۷۶ء کو بروز جمعہ از سر نو اس کا پہلا شمارہ ان ہی کی ادارت میں آگرہ سے شائع ہوا۔ بعد میں یہ اخبار ہفت روزہ ہو گیا۔ لیکن پتھروں کے شہر میں یہ آئینہ فروش اپنی دوکان زیادہ نہ چلا سکا۔ ۲ سال جاری رہ کر ۱۹۷۸ء میں اس کا آخری آئینہ بھی پاش پاش ہو گیا۔ اس سے پہلے ۱۹۷۲ء میں مرزا شمیم بیگ کو امر اجالا ہندی روزنامے کے بانی وایڈیٹر ڈوری لال اپنے ساتھ جوڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ شمیم بیگ امر اجالا ہندی روزنامہ خصوصی نمائندہ اور اسپیشل فیچر نویس ہونے کے ساتھ ساتھ مشہور ہندی اخبار سینک کے لیے بھی لکھتے رہے۔ ڈاکٹر عزیز برنی (اب ایسوسی ایٹ ایڈیٹر روزنامہ راشٹریہ سہارا، اردو، دہلی) جن دنوں دہلی سے ہندی اخبار ''کمینٹیر'' نکالتے تھے، آپ ان سے جڑ گئے۔ آگرہ اور اطراف آگرہ میں آپ ہی اس اخبار کے بیورو کے طور پر کام کرتے رہے۔ آپ نے اردو، اردو صحافت، مسلمانوں کی صحافت، اردو زبان، اردو ادب، اردو تعلیم کے مسائل اور ان کے فروغ کے لیے نہ صرف متعدد مضامین لکھے، بلکہ اردو لائبریری، اردو اسکول، اردو اخبار اور کئی اردو تنظیموں کے قیام کا سہرا بھی آپ کے سر ہے۔ میاں نظیر اکبرآبادی کی یاد میں قائم بزم نظیر کے جنرل سیکرٹری، نظیر لائبریری کے بانی، انجمن محبان اردو کے بانی نائب صدر، بزم میکش کے ممبر اور انجمن ترقی اردو و اسلامیہ لوکل ایجنسی کے فعال رکن ہیں۔

اردو بلیٹن: مرزا شمیم بیگ ایڈووکیٹ نے تاج گنج محلہ سے ''اردو بلیٹن'' کے نام سے ایک فیچر سروس شروع کی۔ جس میں آگرہ کی خبریں، تاریخی معلومات، معلوماتی مضامین، تاریخی فیچر اردو کے قومی و ریاستی اخبارات کو اردو میں بھیجے جاتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مرزا شمیم بیگ اسی کے ساتھ بہترین لیکچرار بھی ہیں۔ پہلے آگرہ یونیورسٹی اور بعد میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں ''پریس لاء'' کے موضوع پر بطور ایک وزیٹنگ لیکچرار کام کیا ہے۔ ان کے خاص موضوع اردو، مسلم پرسنل لاء اقلیتی ادارے اور ان سے متعلق عدلیہ فیصلے، صحافت، آگرہ اور نظیر اکبرآبادی ہیں۔

بنیادی ستون: آگرہ میں اردو صحافت کی تاریخ میں ہفت روزہ بنیادی ستون کے نام سے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ یہ اخبار نوجوان صحافی اسعد تمنا اکبرآبادی نے ۱۳ مارچ ۱۹۹۲ء میں شروع کیا۔ یہ دوورقی اخبار بہت جلد آگرہ میں اردو صحافت کا امتیازی نشان بن گیا۔ اس اخبار نے سرگرم صحافت کے نئے معیار قائم کیے۔ مقتدر مبصرین، اہم ترین اصحاب قلم اور مشہور تجزیہ نگاروں کے مضامین سے اس اخبار کے صفحات مزین کیے جاتے تھے۔ ادارتی صفحہ پر مدیر کے تبصرے قومی سیاست اور معاشرے کے مختلف مسائل پر روز بروز زیادہ سنجیدہ ہوتے چلے گئے۔ انتخاب مضامین مواد کے معیار، خبروں کی ترتیب اور خوش سلیقگی نے اسے آگرہ کا

مقبول عام اخبار بنا دیا۔ اس اخبار نے اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا کہ آگرہ میں اردو صحافت بے دم ہو چکی ہے۔ اس میں صرف نقل سے کام لیا جاتا ہے اور یہ غیر تحقیقی صحافت کا نمونہ ہے۔ اس اخبار کا سرکولیشن ۱۹۹۵ء میں ۱۲۰۰۰ تھا۔ سنہ ۱۳ مارچ ۱۹۹۵ء میں اسے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں نکالنا شروع کیا گیا۔ بنیادی ستون (ہندی) کے مالک پروپرائٹر، پرنٹر اور پبلشر اسعد تمنا ہی ہیں۔ یہ اخبار ۱۹۹۹ء سے بند ہو گیا۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں یہ جواہر لیتھو پریس کشمیری بازار میں چھپتا تھا۔ لیکن یہ تعطل ایک نئے طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی۔

آگرہ ٹوڈے: اصل میں اسعد تمنا اس دوران میں ایک نئے اخبار کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ۲۳ جون ۱۹۹۷ء کو انہوں نے آگرہ کی صحافتی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اسی تاریخ کو انہوں نے آگرہ کی تاریخ کا سب سے پہلا اردو روزنامہ آگرہ ٹوڈے کے نام سے جاری کیا۔ اسعد تمنا ہی کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ وہ آگرہ میں سب سے پہلے اردو کا کمپیوٹر سسٹم لائے۔ یہ اخبار اب کمپیوٹر کمپوزنگ سے ان کے ذاتی پریس جواہر لیتھو پریس کشمیری بازار میں چھپنے لگا۔ یہ پریس ان کے والد عطاء اللہ خاں کا قائم کردہ ہے۔

اس اخبار کے چار صفحوں میں سیاست، معیشت، معاشرت، اقتصادیات، الیکشن، بجٹ اور معاشی امور پر مفصل مباحث ہوتے تھے۔ قومی و بین الاقوامی خبروں کے علاوہ مقامی خبروں کو مناسب جگہ دی جاتی تھی۔ آخری صفحے پر آگرہ کے کسی ایک خاص مسئلے یا پریشانی کو لے کر سب ایڈیٹر اختیار جعفری کا تجزیہ شامل کیا جاتا تھا۔ آگرہ کی تاریخ کا بھی ایک کالم تھا۔ حسن ترتیب اور حسن انتخاب کے لیے ادارتی بورڈ کافی محنت کرتا رہا۔ اخبار کی قیمت ایک روپیہ تھا۔ ۱۹۹۹ء میں اخبار کا سرکولیشن ۱۲ ہزار سے زیادہ ہے۔ جس وقت اخبار شروع ہوا اس وقت اخبار کی کل ایک ہزار کاپیاں شائع ہوتی تھیں۔ اسعد تمنا اکبر آبادی بی اے تک تعلیم یافتہ ہیں۔ اخبار جواہر لیتھو پریس کشمیری بازار میں چھپتا تھا۔ اخبار کا دفتر بھی یہی پریس کا دفتر تھا۔ اسعد تمنا ہی اخبار کے ایڈیٹر اور پریس کے انچارج بھی تھے۔ اخبار کی پرنٹر و پبلشر عروب تمنا تھیں۔ یہ اخبار ۲۰۰۰ء میں مالی مسائل کی وجہ سے بند ہو گیا۔

خلاصہ:

آگرہ کی علمی تاریخ ۱۵۰۰ء میں سکندر لودھی کے ذریعہ آگرہ کو دارالسلطنت بنا لینے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ مغلوں کے عہد میں اسے عروج حاصل ہوا اور انیسویں صدی میں اردو ادب کا ایک شاندار ذخیرہ آگرہ میں مرتب ہوا۔ اس ذخیرہ میں اسلامیات، ہندو مذہب، عیسائیت، تاریخ، جغرافیہ، میڈیکل سائنس، تعلیم، سائنس، قانون وغیرہ پر لاتعداد کتابیں لکھی گئیں۔ اس قلمی تحریک کو پروان چڑھانے میں یہاں کے اردو رسائل و اخبارات کا نہایت اہم کردار ہے۔ آگرہ کی علمی تاریخ بغیر اخبارات و مطابع کے تذکرے کے مرتب نہیں کی جا سکتی۔ آگرہ میں صحافت کا آغاز صحافت کے عمومی آغاز کی طرح انگریزی صحافت سے ہوا۔ یہاں سے پہلا انگریزی اخبار ڈاکٹر جان ہنڈرسن نے ۱۸۳۳ء میں ''آگرہ اخبار'' کے نام سے نکالا۔ جو بعد میں اسی نام سے فارسی میں نکلنے لگا تھا۔ اس کے بعد یکے دیگرے کم از کم ۷ انگریزی اخبار یہاں سے جاری ہوئے۔ ان میں سب سے آخری اخبار غالباً ۱۸۹۰ میں دی پیوپلز ہیرالڈ جاری ہوا تھا، جس کے ایڈیٹر منشی نورنگی لال اور جان ابراہیم تھے۔ اس ہفت روزہ اخبار میں دیوانی، میونسپلٹی، سماجی و علمی مضامین و خبریں شائع کی جاتی تھیں۔ عیسائیت کی تبلیغ بھی ہوتی تھی۔

انگریزی کے بعد آگرہ سے فارسی اخبارات جاری ہوئے تھے۔ یہ تعداد میں کم از کم ۴ ہیں۔ آگرہ اخبار کا ذکر پہلے آ چکا ہے جو انگریزی سے فارسی میں تبدیلی ہوا تھا۔ لیکن ۱۸۸۳ء میں فارسی کا پہلا باقاعدہ اخبار ''زبدۃ الاخبار'' مولانا واجد علی خاں نے نے جاری کیا۔ جب کہ پہلا علمی اخبار ''صدرالاخبار واخبارالحقائق'' کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ اخبار مسٹر فنک نے ۱۸۴۶ء میں جاری کیا تھا۔ یہ ہفتے میں ۲ بار مطبع آگرہ اخبار سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں سیاسی و ادبی اور سائنٹیفک تعلیم کے مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ تب سے اردو صحافت کی یہ روایت تقریباً ۱۵۴ سال بعد آج ۲۰۰۲ء میں بھی جاری ہے۔ اس درمیان اس شہر میں تقریباً پونے دو سو اخبارات و رسائل جاری ہوئے تھے۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق کم از کم ۱۱۶۷ اخبارات و رسائل تحریری شکل میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔

اس ڈیڑھ صدی سے زائد عرصے میں آگرہ کی اردو صحافت نے ارتقاء و زوال کے کئی دور دیکھے ہیں۔ ایک طرف غیر ملکی مذہب اور غیر ملکی حکومت کا مقابلہ کرتے اخبار نظر آتے ہیں تو دوسری طرف اپنے سماج و قوم کی علمی، تعلیمی، قانونی، سیاسی، طبی، تجارتی، ادبی، تاریخی، مذہبی اور شاعرانہ ضروریات پوری کرتے ہوئے یہ اخبارات روز و شب مصروف نظر آتے ہیں۔ ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اوسطاً ہر سال آگرہ سے ایک اخبار یا رسالہ کا اجرا ہوا۔ بلکہ درمیانی عہد میں تو ایک ہی سال میں متعدد اخبارات کے اجراء نظر آتے ہیں۔ جیسے ۱۸۵۶ء میں ۶ رسائل جاری ہوئے۔ اسی طرح ۱۸۶۲ء میں ۱۴ اور ۱۸۸۴ء میں ۱۱۰ اخبار جاری ہوئے ہیں۔ دیگر کئی برسوں میں بھی عموماً ایک سے زائد اخبارات کے اجراء کا اندراج ملتا ہے۔ آگرہ کے اہل علم نے عوام کی تمام ذہنی و قلبی اور جسمانی و قلمی ضروریات کے تحت رسائل جاری کیے۔ مثال کے طور پر جہاں قانونی ضرورت کے تحت ۵ رسالے نکالے گئے وہیں طبی ضروریات اور میڈیکل سائنس کے ۷ اخبارات بھی جاری ہوئے۔ تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے ۱۱ رسائل کا اجراء بتاتا ہے کہ اہل علم کو تعلیم، اسکولوں، نصابات اور طلباء کے مسائل و ضروریات کا بخوبی ادراک تھا۔ اسی طرح یہاں سے ۱۵ سے زائد شعری گل دستوں کا جاری ہونا اہل آگرہ کی خوش ذوقی اور شعری مزاج کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ اس بات کی بھی غمازی کرتا ہے کہ آگرہ کے خمیر سے اٹھے خان آرزوؔ، باطنؔ، پریشانؔ، غلام غوث بے خبرؔ، منشی نبی بخش حقیرؔ، میر تقی میرؔ، نظیر اکبر آبادی اور غالبؔ کا تعلق ذہنی و روحانی اعتبار سے آگرہ سے بے حد پیوستہ تھا۔ روحانیت کے لحاظ سے بھی یہ زمین زرخیز رہی۔ یہاں قاضی نور اللہ شوشتری سے لے کر دارا شکوہ تک اور خان آرزوؔ سے لے کر مفتی انتظام اللہ شہابی تک روحانیت کے بے شمار سرتاج پیدا ہوئے اور ترقی کی منازل تک پہنچے۔ اخبارات کی فہرست میں قطب الاخبار، اخبارالنواح، بدھی پرکاش، گیان پرکاش، ستیہ پرکاش، ابوالعلائی، اعجاز محمدی، اندو پرکاش، حیات جاودانی، اسرار محمدی، نزہت الارواح اور پریم پرچارک وغیرہ روحانی رسائل اس میدان میں آگرہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی نہیں یہاں سے مسز خاموشؔ جیسی خواتین نے کم از کم ۱۲ اخبار صرف خواتین کے لیے نکالے ان میں سے ایک اخبار پردہ نشیں میں صرف خواتین کی تخلیقات ہی شائع کی جاتی تھیں۔ مزاح نگاری سے بھی آگرہ کی صحافت اچھوتی نہیں رہی۔ تفریح الناظرین، جاسوس، وغیرہ اخبارات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہاں سے ۴۵ ہفت روزہ اخبارات جاری ہوئے۔ جبکہ ماہنامے ۶۵ ہیں۔ روزنامے صرف ۳ ہیں۔ دوسرے دو تاج اردو اور آگرہ ٹوڈے آزادی کے بعد جاری ہوئے۔ ہندوستان کی آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد اہل علم تقریباً سو فیصد ہی آگرہ سے پاکستان ہجرت کر گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد آگرہ میں مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تحریک منجمد سی نظر آتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ صحافت میں ہندوؤں کے نام شامل ہیں جنھوں نے اردو میں اخبار نکالے۔ حالانکہ آج یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ ان کے علاوہ ۷ اخبارات انگریزوں یا عیسائیوں نے اردو میں نکالے ہیں۔ آگرہ سے نہ صرف اپنے اپنے ذوق کے علمی و فنی اخبارات و رسائل جاری ہوئے بلکہ اپنی قوم و سماج کی ترجمانی کے لیے بھی اخبارات نکالے

گئے۔ مثال کے طور پر ہندوؤں کی کھتری قوم کے حالات کی ترجمانی ''کھتری ہتکاری'' انجام دیتا تھا۔ اسی طرح ''آریہ متر'' آریہ قوم کے حالات کا ترجمان تھا۔ ''ساندھیہ اپکارک''، ''برہمن سماج''، ''کایستھ سماج''، ''ہمدرد اسلام'' و ''مسلم سیوک'' مسلمانوں کے حالات و مسائل، ''راجپوت'' ہندوؤں کی راجپوت قوم کے مسائل و حالات کا ترجمان تھا۔ آگرہ کی اردو صحافت کا یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ یہاں کے اہل علم نے اخبار نویسی کو گویا نشہ سا بنا لیا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ ایک ہی شخص نے متعدد اخبار اور رسالے نکالے۔ نہ صرف یکے بعد دیگرے، بلکہ ایک ہی وقت میں ایک ہی شخص متعدد جرائد کا ایڈیٹر، مہتمم یا مالک نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر منشی قمرالدین قمرؔ نے دو اخبار اسعد الاخبار اور معیار الشعراء نکالے۔ اسی طرح منشی سدا سکھ لال نے نورالابصار، معلم العلماء، بدھی پرکاش، منشی شیونرائن آرامؔ نے معیار الشعراء اور مفید الاخلاق، حسن بخش نے فوج داری پریس، گورنمنٹ گزٹ مغربی وشمالی، حکیم جواہر لال نے مصدر النوادر، نزہت الارواح، خان بہادر میر ناصر علی دہلوی نے تیرھویں صدی، صلائے عام، زمانہ، افسانۂ ایام، منشی کرامت علی کمالؔ نے تکملہ، محمدی، فلاسفر، عاشق حسین بزمؔ نے انیس ہند، گل کدہ زینت سخن، دارالسلام، بانکے لال زارؔ بدایونی نے خیال یار و گلدستہ مضامین، شاہ دلگیر نے آگرہ اخبار، مفید عام، نقاد، صادق علی خاں قیصرؔ نے معدن الحکمت، نسیم جنت، صادق المطابع، صبا اکبر آبادی نے آزاد، مشورہ، سیماب اکبر آبادی نے مرصع، تاج، کنول، پیمانہ، ساقی، شاعر، عمر تیموری نے شبستاں، ساقی، تاج، مقبول، قومی وقار، تاج ور، ٹائمس آف تاج ور اور اسد تمنا نے بنیادی ستون اردو، بنیادی ستون ہندی، آگرہ ٹوڈے روزنامہ جاری کیے، ان کے ایڈیٹر رہے، مالک تھے یا مہتمم وغیرہ۔ ایسے حضرات کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔

آگرہ میں اردو صحافت کے اس ارتقائی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ روز اول سے ہی آگرہ کی اردو صحافت نے عوامی ضروریات اور علمی خدمت کو اپنا مقصد اولین بنایا ہے۔ اس مقصد میں وہ کامیاب بھی رہی ہے۔ عوام نے اردو صحافت پر بھروسہ کیا اور اس نے اس بھروسے کی لاج رکھی۔ ۱۸۳۳ء سے اردو صحافت کی ایک شاندار اور سنہری تاریخ ہے جس کا سفر آج تقریباً پونے دو سو سال بعد بھی راہ مستقیم پر جاری ہے۔

حواشی و حوالے

۱۔ ڈاکٹر لکشمی کانت پانڈے۔ پترکارتا کے سدھانت اور پریوگ (ہندی) ص ۳۶
۲۔ ڈاکٹر خلیق انجم۔ اردو صحافت، ص ۹، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۷ء
۳۔ انور علی دہلوی۔ اردو صحافت، ص ۱۲، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۷ء
۴۔ مولانا سعید احمد مارہروی۔ مرقع اکبر آباد، ص ۱۳۷
۵۔ محمد عتیق صدیقی۔ ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں۔ انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، پہلا ایڈیشن ۱۹۵۷، ص ۲۶۴
۶۔ محمد عتیق صدیقی۔ ایضاً، ص ۲۶۴
۷۔ محمد عتیق صدیقی۔ ایضاً، ص ۲۲۹
۸۔ نواب سید محمد اشرف۔ اختر شاہنشہی، طبع اول ماہ جون ۱۸۸۸ء، مطبع اختر پریس، لکھنو
۹۔ علامہ امداد صابری۔ اردو صحافت کی تاریخ جلد اول ص ۶۹
۱۰۔ پی سی اسمتھ۔ بحوالہ عتیق صدیقی، صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۲
۱۱۔ محمد عتیق صدیقی۔ ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۲۸۸

مولانا حسرت موہانی کی تذکرہ نگاری

شفقت رضوی

حسرت موہانی نے علم و ادب کے لیے زندگی وقف کر رکھی تھی۔ انہیں شاعری کا شوق اس زمانہ ہی میں پیدا ہو گیا تھا جب ان کی عمر ۱۲، ۱۳ سال تھی۔ وقت کے ساتھ ان کی شاعری پروان چڑھتی رہی۔ ساتھ ہی وسائل نہ ہونے کے باوجود انہوں نے ماقبل کے شعراء سے معروف و غیر معروف کے دواوین جمع کرنے کی سعی و جستجو کی یہاں تک کہ ان کے کتب خانہ میں ایک عظیم الشان اور ہر قیمت سے بالاتر ذخیرہ جمع ہو گیا۔ جس شاعر کا کلام انہیں دستیاب ہوتا وہ اس کے بارے میں جمع کوائف حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور کلام پر ناقدانہ نظر ڈال کر اس کے حسن و قبح کا جائزہ لیتے۔ ان کا یہ شوق اس وقت بھی جاری تھا جب وہ علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم تھے۔ وہاں ان کا زمانہ تعلیم ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۳ء تک رہا۔ سید سجاد حیدر یلدرم ان سے سینئر تھے انہوں نے ۱۹۰۰ء میں بی اے کر لیا تھا اس کے بعد بھی ان کا قیام علی گڑھ میں رہا۔ اپریل ۱۹۰۰ء میں انہوں نے ایک ادبی انجمن قائم کی۔ نام رکھا ''انجمن اردوئے معلیٰ''۔ حسرت موہانی اس انجمن کے سرگرم رکن بن گئے۔ اس کی نشستوں میں شعر سناتے اور مضامین پڑھتے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم نے ''خافی خاں'' کے قلمی نام سے حسرت موہانی کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے اس میں ان کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

> ''اردو ادب سے اس شخص کو عشق تھا جس زمانے میں عام طالب علم دارالاقامت اور بیت الطعام کے مناصب مانیٹری کی تلاش میں سرگرداں و پریشاں رہتے۔ اس دور میں فضل اساتذہ قدیم کے دیوان جمع کرنے اور ان کی خشک ہڈیوں پر ''غم بازنی'' پڑھنے کی فکر میں رہتے چنانچہ کئی مشہور اور بہت سے بھولے ہوئے شعرائے اردو کے کلام کا اتنا بڑا مجموعہ اس قدامت پرست نے جمع کر لیا کہ شاید پرانے کتب خانوں کے سوا کہیں نہ ہو''۔
>
> (خافی خاں: مضمون ''حسرت موہانی، ایک قدر دان کی نظر میں: مشمولہ رسالہ زمانہ دسمبر ۱۹۰۸ء: ص ۲۹۴)

اسی مضمون میں انجمن اردوئے معلیٰ سے حسرت کی وابستگی کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے:

> ''اسی انجمن کی ترقی کے لیے مولانا سے بہتر رکن کون ہو سکتا تھا چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں اردوئے معلیٰ اور مولانا ایسے لازم و ملزوم ہو گئے کہ ایک کا خیال دوسرے کے بغیر ممکن ہی نہ ہوتا تھا۔ مولانا کی غزلیں مشاعرے کی جان اور ان کے مضامین معاشرے کے روح رواں خیال کیے جاتے تھے''۔ (حوالہ مذکورہ: ص ۲۹۴)

انجمن اردوئے معلیٰ کے جلسوں میں حسرت موہانی نے اصغر علی خاں نسیم دہلوی، سید محمد خاں رند، منیرؔ شکوہ آبادی اور سالک شاگرد غالب پر مضامین پڑھے تھے۔ یہ گویا تذکرۃ الشعرا لکھنے کی جانب ابتدائی کوششیں تھیں۔ سالک اور منیرؔ پر لکھے گئے ان کے مضامین محمڈن اور نیشنل کالج میگزین میں بالترتیب اپریل ۱۹۰۴ء اور جولائی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئے جبکہ ان کا ایک مضمون مصحفیؔ

کے شاگرد عیشی کے بارے میں رسالہ مخزن لاہور میں جنوری ۱۹۰۱ء میں چھپ چکا تھا۔

حسرت موہانی کے مطالعہ میں اردو شعرا کے قدیم تذکرے بھی رہے۔ جب انہیں تذکرہ لکھنے کا خیال آیا تو انھوں نے قدیم تذکروں سے رہنمائی حاصل کی۔ جو تذکرے ان کے زیر مطالعہ رہے ان کی فہرست بھی ایک مضمون میں درج کی ہے جو حسب صراحت ذیل ہے:

ا۔ نکات شعرا (میر تقی میر) تذکرۃ الشعرا (غلام ہمدانی مصحفی) طبقات شعرائے ہند (ترجمہ دی تاسی مصنف فرانسیسی) تذکرہ جلوہ خضر (فرزند احمد صفیر بلگرامی) تذکرہ الشعرا (حکیم قدرت اللہ خاں قاسم) گلشن بے خار (مصطفیٰ خاں شیفتہ) تذکرہ سخن شعرا (عبدالغفور نساخ) تذکرہ طور کلیم (نورالحسن کلیم) تذکرہ بزم سخن (علی حسن خاں) تذکرہ آب حیات (آزاد)۔

(رسالہ اردوئے معلیٰ: جولائی ۱۹۰۳ء: ص ۱)

ان میں وہ آزاد کے تذکرہ ''آب حیات'' سے زیادہ متاثر ہوئے۔ دراصل اسی تذکرے نے انہیں تذکرہ لکھنے کی تحریک کی۔ چنانچہ انھوں نے لکھا:

> ''آزاد کے دردمند دل کو اردو کی محبت نے مجبور کیا۔ تذکرہ آب حیات لکھا اور حق یہ ہے کہ بے مثل لکھا یہ اسی کی بدولت ہے کہ کبھی مصحفی کا نام زبان پر آ جاتا۔ جس طرح آزاد نے مصحفی کے نام کو روشن کیا خدا اس کی شہرت قیامت تک قائم رکھے''
>
> ''بندہ حسرت کی آرزو کہتی ہے کہ مصحفی کی طرح ان کے شاگردوں ہوس، شہدی، عیشی، غافل، گرم، منتظر، تنہا بھی اپنے کمال کی کیوں نہ داد پائیں۔ آزاد پرذوق مومن اور غالب کا حق تھا، حسرت پر نسیم، تسلیم و اسیر کا حق ہے۔ (حوالہ مذکور)

حسرت موہانی نے اپنے ''تذکرۃ الشعرا'' کے لیے دو منصوبے تیار کیے۔ پہلا منصوبہ اردوئے معلیٰ جولائی ۱۹۰۳ء میں پیش کیا۔ اس کے بارے میں کچھ تفصیل اگلے شمارہ (اگست ۱۹۰۳) میں دی۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء میں اس کا اعادہ کیا۔ دوسرا منصوبہ وہ ہے جو ''ارباب سخن'' کے عنوان سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔

اردو شاعری کے زیادہ تر تذکرے اس طرح لکھے گئے ہیں کہ شاعروں کو ان کے تخلص کے حروف تہجی کے لحاظ سے رکھا ہے۔ اس سے یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے کہ شاعر کا تعلق کس زمانے سے ہے۔ یہ مرحلہ مزید مشکل ہو جاتا ہے جب تذکرے میں سنین کا التزام نہیں ہوتا۔ تذکرہ نویسی کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ بلحاظ زمانہ شاعروں کو طبقات میں تقسیم کر دیا جاتا۔ یہ بڑی حد تک مناسب اور تاریخی تسلسل میں ہوتا۔ حسرت نے جدید طریقہ ایجاد کیا۔ ان کے خیال میں بڑا شاعر اپنے دائمی نقش اپنی شاعری میں تو چھوڑتا ہی ہے ساتھ ہی وہ اپنے شاگردوں کو اپنے رنگ میں ڈھالتا بھی ہے۔ اس طرح ایک دبستان شاعری وجود میں آ جاتا ہے۔ اس طرح کا مطالعہ عام نہیں ہے کہ دیکھا جائے کس شاعر کے کلام میں اس کے استاد کا رنگ ہے۔ وہ جس نوع کا تذکرہ لکھنا چاہتے تھے، اس کے منصوبے میں بیان کیا کہ:

> ''زمانہ شاعری کی تقسیم طبقات کے لحاظ سے چاہیے تھی لیکن دلچسپی مزید کے خیال سے میں اس طریق کو پسند کرتا ہوں کہ دور اول کے کسی استاد کا حال لکھ کر ضمن میں اس کے سلسلہ تلمذ میں اس وقت تک جتنے استاد ہوئے ہیں ان سب کا ذکر لکھا جائے اور پھر اسی طور پر دور اول کے دوسرے استاد کا ذکر شروع ہو۔ سب سے پہلے سلسلہ حاتم سے شروع کرتا ہوں اس کی کئی وجہیں ہیں، اول تو یہ کہ صرف یہی ایک ایسا سلسلہ ہے جو باوجود قدامت اس وقت تک قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ بندے کو بھی اس خاندان شاعری سے تعلق ہے''۔ (حوالہ مذکور)

اسی اصول کے تحت انہوں نے ایک نقشہ (شجرہ) بھی شائع کیا جس میں شاہ حاتم کے سلسلہ تلامذہ کا خاتمہ تسلیم لکھنوی و معاصرین میں ہوا ہے۔ انہوں نے دیگر شعرا کے سلسلے کے نقشے بھی شائع کیے۔ جہاں تک ان کی تحریری کاوشوں کا تعلق ہے انہوں نے شاہ حاتم کے سلسلے کو آٹھ طبقات میں تقسیم کر کے ہر طبقے میں شامل شاعروں کے نام نقشے میں درج کیے لیکن وہ اس نقشہ کے مطابق ہر شاعر کا ترجمہ (مضمون) نہ لکھ سکے۔ اپنے منصوبے کی مزید تفصیلات انہوں نے اکتوبر ۱۹۰۹ کے اردوئے معلیٰ کے شمارہ میں لکھیں۔ وہ منصوبے کو کس حد تک پھیلانا چاہتے تھے اس کا اندازہ اس تحریر سے ہو سکتا ہے:

> ''مدت سے ہمارا ارادہ تھا کہ اردو زبان کے تمام گزشتہ اور موجودہ اساتذہ کا ایک ایسا تذکرہ ترتیب دیا جائے جس میں ہر استاد کا مفصل حال اور اس کے کلام پر بے لاگ تنقید موجود ہو۔ اور اس تذکرے کی تقسیم باعتبار سلاسل شعرا پانچ جلدوں میں ہو اس طور پر کہ جلد اول میں سلسلہ شاہ حاتم کے کل اساتذہ اور صاحب دیوان شعرا کا ذکر ہو، جلد دوم میں سلسلہ مصحفی کا، جلد سوم میں سلسلہ ناسخ کا، جلد چہارم میں سلاسل میر تقی میر، میر سوز، میرزا مظہر، جعفر علی حسرت و میرزا غالب کا اور جلد پنجم میں اساتذہ متفرق کا حال درج ہو''۔ (رسالہ اردوئے معلیٰ: اکتوبر ۱۹۰۹ء، صفحہ ۱)

> ''علاوہ بریں تکمیل دلچسپی و جامعیت کی غرض سے تذکرہ مذکور سے علاحدہ پانچ ہی جلدوں میں ایک دوسرا مجموعہ ''انتخاب دواوین'' تیار ہو۔ (ایضاً)

> ''اردوئے معلیٰ میں اس وقت تک جتنے مضامین زیر عنوان تذکرۃ الشعرا نکلے یا جن میں دواوین کا انتخاب بطور ضمیمہ شائع ہوا ان سب کی نسبت سمجھنا چاہیے کہ انہی ارادوں کو مدنظر رکھ کر بطور مشق شائع کیے گئے۔ ان مضامین کے لکھنے میں بحیثیت مشق اول خاص سلسلہ اور سلسلے میں کسی خاص ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ جس ماہ میں جس شاعر کا حال بآسانی لکھا جا سکا لکھا گیا لیکن آئندہ کے لیے اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ ایک ایک سلسلے کو لے کر اس کے کل متعلق شاعروں کا حال بہ ترتیب درج رسالہ ہو اور ہر ماہ میں قسم خاص کے خریداروں کو بطور ضمیمہ اردوئے معلیٰ کم از کم ایک دیوان کا انتخاب دیا جائے''۔

حسرت کے ارادے اور منصوبے اپنی جگہ مگر وہ منصوبے کے تحت تذکرہ نہیں لکھ سکے۔ کوشش کے باوجود نہ تو وہ کسی سلسلے کو پورا کر سکے اور نہ ہر ماہ لازماً کسی شاعر پر نہیں لکھا لیکن جہاں تک انتخاب دواوین کا تعلق ہے وہ اس کے منصوبے میں ضرور کامیاب ہوئے۔ رسالے کے ہر شمارے کے ساتھ ایک یا ایک سے زائد انتخاب ضرور شائع کیے اور ''انتخاب سخن'' کی گیارہ جلدیں مکمل کیں۔

رسالہ اردوئے معلیٰ کے پہلے دور (جولائی ۱۹۰۳ء تا اپریل ۱۹۰۸ء) میں تقریباً (۳۰) شعرا پر مضامین شائع ہوئے۔ دور دوم میں (اکتوبر ۱۹۰۹ء تا جون ۱۹۱۳ء) میں (۵۵) شعرا کا حال لکھا۔

۱۹۰۳ء میں جب حکومت نے حسرت موہانی کے ''اردو پریس'' سے ضمانت طلب کی تو انہوں نے ضمانت کی رقم جمع نہ کی اردو پریس بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ اردوئے معلیٰ بھی مسدود ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ''تذکرۃ الشعراء'' کے نام سے ایک کتابی سلسلہ شروع کیا۔ اس کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

> ''مئی ۱۹۱۳ء میں حکومت نے اردو پریس سے تین ہزار کی ضمانت طلب کی جو انہیں کی گئی اس لیے اردو پریس کا خاتمہ

ہوگیااوراسی کے ساتھ اردوئے معلیٰ بھی بند ہوگیا۔ سیاسی حیثیت سے اردوئے معلیٰ اپنا فرض ادا کر چکا۔ اس کا اظہار آخری رسالے میں آ چکا ہے البتہ ادبی حیثیت سے مقاصد ناتمام رہ گئے تھے جن کی تکمیل کے لیے یہ تذکرہ کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے۔ فی الحال اس کتاب کے ہر سال چار جزو اور ہر جزو کے کم از کم ۱۰۰ صفحات شائع ہوا کریں گے اور ہر چار اجزا کی پیشگی قیمت (دو روپیہ) مع محصول ڈاک لی جائے گی۔ ہر جزو میں کچھ حصہ تذکرۃ الشعرا کا ہوگا باقی اوراق میں کلام اساتذہ کا انتخاب ہوگا جس کا بیشتر حصہ اس وقت تک غیر مطبوعہ اور کمیاب ہے''۔ (تذکرۃ الشعرا، حصہ اول جزو اول، جولائی ۱۹۱۴ء، صفحہ ۱)

اردوئے معلیٰ میں سلسلہ شاہ حاتم کے اکثر شعرا کا حال لکھا جا چکا تھا اس سلسلے کی تکمیل ''تذکرۃ الشعرا'' میں ہوئی۔ اس کے حصہ اول جزو اول میں حیات بخش رسا اور جزو دوم میں محمد امان نثار دہلوی، بقا اللہ خاں بقاؔ اور مرزا محمد تقی مائل دہلوی پر مضامین چھپے۔ اسی کے ساتھ یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ بعد کے حصوں میں بغیر کسی خاص ترتیب کے مضامین چھپتے رہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ حصہ اول جزو اول میں ایک مضمون ثاقب مراد آبادی کے بارے میں ہے۔ بعض محققین نے اسے بھی حسرت کی تحریر قرار دیا ہے حالانکہ مضمون کے آخر میں واضح طور پر مضمون نگار کا نام ''محمد علی عرش ملیح آبادی'' درج ہے۔ تذکرۃ الشعرا میں شائع ہونے والی نگارشات کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

حصہ اول جزو اول (جولائی ۱۹۰۴)

تذکرہ حیات بخش رسا، مضمون ''ثاقب بدایونی از محمد علی عرش ملیح آبادی''
تعزیت نامے: احسان شاہ جہاں پوری، ہجرت شاہ جہاں پوری، انیس اکبر آبادی، کیف اور عظمت اللہ خاں
انتخاب دواوین: اسیر، تنہا، شہیدی (شاگردان مصحفی)
تبصرہ کتاب ورسائل:
حسرت کی تازہ غزل: اور پشت پر سدیشی اسٹور کا پورے صفحہ کا اشتہار

حصہ اول، جزو دوم: (اکتوبر ۱۹۱۴)

تذکرہ: محمد امان نثار دہلوی، بقا اللہ خاں بقاؔ، مرزا محمد تقی مائل دہلوی
انتخاب دواوین: مخمور لکھنوی، عیشی، شہیدی، آتش، غافل
مضمون: ادب الکاتب والشاعر (قسط) از نظم طباطبائی
کلام: حسرت موہانی اور امیر بدایونی

حصہ اول جزو سوم: (جنوری ۱۹۱۰)

مضمون: غزل گوئی اور اس کے شرائط از امداد امام اثر
انتخاب دواوین، مومن، حسرت موہانی
تعزیت نامے: شبلی نعمانی، حالی، منشی سجاد حسین
تبصرہ کتب ورسائل:

حصہ اول جزو چہارم (اپریل ۱۹۱۵)

تذکرہ: شبلی نعمانی
انتخاب دواوین: مومن، نسیم، تسلیم
تبصرہ کتب ورسائل

حصہ اول جزو پنجم (جولائی ۱۹۱۵)

تذکرہ: الطاف حسین حالی، منشی سجاد حسین، ثاقب اکبر آبادی، مست بنارسی
انتخاب دواوین: رشکی، حالی، بینظیر، مست بنارسی، مضطر خیر آبادی
تذکرۃ الشعرا کے سلسلے کے پانچ جزو ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ ان کی تفصیل درج کی گئی۔ اس کے حصہ دوم کے کسی جزو کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا۔ حصہ دوم کی اشاعت کی اطلاع کے لیے ہم ڈاکٹر احمد لاری کے شکر گزار ہیں۔ درج ذیل معلومات ان ہی کے مواد سے درج کی جا سکتی ہیں۔ حسرت موہانی حصہ دوم جزو اول کے اشاعت کے موقع پر لکھا ہے:

''الحمدللہ تین سال سے زائد بند رہنے کے بعد آج تذکرۃ الشعرا دوبارہ شائع ہوتا ہے امید ہے کہ آئندہ برابر جاری رہے گا اور التوائے اشاعت کی نوبت کبھی نہ آئے گی۔

''دسمبر ۱۹۱۵ء تک تذکرۃ الشعرا حصہ اول کے پرچے شائع ہو چکے تھے اور حصہ دوم کا پہلا پرچہ بابت جنوری، فروری، مارچ ۱۹۱۶ء تیار تھا کہ دفعتاً ایڈیٹر کے خلاف نظر بندی کے احکام جاری ہو گئے اور پرچہ جوں کا توں رکھا رہ گیا۔ پس اب سال میں چار پرچوں کے بجائے بلا تعین وقت ۱۲ پرچوں کے نکالنے کا قصد ہے جولائی و اگست ۱۸۱۸ء کے ڈبل نمبر کے ساتھ جس کو حصہ سوم کا جزو دوم، سوم سمجھنا چاہیے ۱۹۱۶ء کا پرچہ بھی روانہ کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کے پاس حصہ دوم کی جلد مکمل رہے۔ (تذکرۃ الشعراء: حصہ دوم، جزو دوم وسوم، از حسرت موہانی بحوالہ ''حسرت موہانی، حیات وکارنامے از احمد لاری مطبوعہ، س ۱۹: صفحہ ۲۹۶)

حصہ دوم، جزو اول: جنوری ۱۹۱۶ء

اس میں تفصیلاً حالات غالب درج ہیں۔

حصہ دوم، جزو دوم وسوم، دسمبر ۱۹۱۶ء

تذکرہ: گستاخ رامپوری۔ نکات سخن کے چند صفحات، تازہ کلام حسرت
تذکرۃ الشعرا کے متذکرہ دو حصے ۱۹۱۶ء میں چھپ چکے تھے۔ حسرت موہانی کی نظر بندی کی وجہ سے ان کی اشاعت اور تشہیر خاطر خواہ طور پر نہیں ہوئی۔ حسرت نے اواخر ۱۹۱۸ء میں نظر بندی ختم ہونے کے بعد ان کے اشاعت کا اہتمام کیا۔

تذکرۃ الشعرا میں مجموعی طور پر ۹ شاعروں کے احوال شائع ہوئے۔

حسرت موہانی نے رسالہ اردوئے معلیٰ کو جنوری ۱۹۲۵ء سے دوبارہ جاری کیا۔ رسالے کے اس دور میں کبھی وقت پر شائع نہ ہوا پھر بھی اس کی چند اشاعتوں میں تذکرۃ الشعرا کا سلسلہ جاری رہا۔ اس میں بھی منصوبے کے مطابق ترتیب نہیں رکھی گئی بلکہ ایک نیا مطبوعہ ''ارباب سخن'' کے نام سے پیش کیا۔ اس کی اشاعت اردوئے معلیٰ میں جنوری ۱۹۲۵ء سے دسمبر ۱۹۲۷ء تک بالا قساط ہوتی رہی۔ بعد میں اسے کتابی صورت میں رئیس المطابع پٹنا پور میں طبع کروا کر ۱۹۲۹ء میں شائع کیا گیا۔ اس کے دیباچے میں

انہوں نے نئے منصوبے کے خدوخال اس طرح بیان کیے:

''ارباب سخن:۔ اس نام سے ہم شعرائے اردو کا ایک جامع اور مستند تذکرہ لکھنا چاہتے ہیں جس کے مفصلہ ذیل پانچ حصے قرار دیے گئے ہیں۔

حصہ اول: سلاسل شعرائے اردو، جس میں اردو شعرا کی ترتیب وتقسیم ان کے سلسلہ شاعری کے اعتبار سے درج کی جائے گی۔ اس کے دیکھنے سے بہ یک نظر معلوم ہو سکے گا کہ کس شاعر کا کس خاندان سے تعلق ہے۔

حصہ دوم: فہرست شعرائے اردو، اس میں مذکورہ بالا سلاسل کے جملہ اردو شاعروں کی ایک مکمل فہرست بقید نام ونشان مرتب کی جائے گی۔

حصہ سوم: تذکرہ شعرائے اردو: اس میں تمام قابل ذکر شعرائے اردو کا حال مع انتخاب کلام درج کیا جائے گا۔

حصہ چہارم: طبقات شعرائے اردو: جس میں اردو زبان کے جملہ مشہور اور صاحب دیوان اساتذہ کو تقسیم ان کے زمانہ شاعری کے لحاظ سے مفصلہ ذیل سات طبقوں میں کی جائے گی۔

طبقہ اول: از ابتدائے عہد تا ۱۱۸۰ھ

طبقہ دوم: از ۱۱۸۱ھ تا ۱۲۱۰ھ

طبقہ سوم: از ۱۲۱۱ھ تا ۱۲۴۰ھ

طبقہ چہارم: از ۱۲۴۱ھ تا ۱۲۷۰ھ

طبقہ پنجم: از ۱۲۷۱ھ تا ۱۳۰۰ھ

طبقہ ششم: از ۱۳۰۱ھ تا ۱۳۳۰ھ

طبقہ ہفتم: از ۱۳۳۱ھ تا دان''

ارباب سخن کے حصہ اول اور دوم کتاب میں شامل ہیں۔ حصہ اول سلاسل شعرا کے نقشوں اور حصہ دوم ان نقشوں کے مطابق فہرست پر مشتمل ہیں جن اساتذہ کے سلاسل نقشوں میں ظاہر کیے ہیں اور جن کی فہرست مرتب کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سلسلہ شاہ حاتم وشاگردان شاہ حاتم	۲۔ سلسلہ ذوق وشاگردان ذوق
۳۔ سلسلہ مومن وشاگردان مومن	۴۔ سلسلہ مظہر جاناں
۵۔ سلسلہ میر تقی میر	۶۔ سلسلہ خواجہ میر درد
۷۔ سلسلہ میر سوز	۸۔ سلسلہ حسرت وجرأت
۹۔ سلسلہ مصحفی	۱۰۔ سلسلہ آتش
۱۱۔ سلسلہ امیر وامیر	۱۲۔ سلسلہ ناسخ
۱۳۔ سلسلہ وزیر	۱۴۔ سلسلہ غالب

۱۵۔ اساتذہ متفرق صاحب دیوان

ارباب سخن کا تیسرا حصہ وہی ہے جس کا اعلان انہوں نے تذکرۃ الشعرا کے ضمن میں جولائی ۱۹۰۳ء میں کیا تھا اور جس کے مطالب وہ مضامین میں لکھتے رہے تھے البتہ چوتھا حصے میں ادوار کی ترتیب میں شعرا کو طبقوں میں تقسیم کر کے ان کے بارے میں لکھنے کا تھا۔ ان کے علاوہ وہ ایک حصہ مرثیاں اردو کے بارے میں مختص کرنے کا تھا جس میں ''شاہاں وامرائے دہلی واودھ و امرائے مرشد آباد، عظیم آباد، حیدر آباد، لاہور، بھوپال، ٹونک، بنارس، کدورہ، فرخ آباد و بانده وغیرہ'' سے ان سب کا حال درج کیا جانا تھا جو خود شاعر تھے اور جنہوں نے اپنے زمانے کے مشاہیر سخن کی مولدگری کی تھی۔

اردوئے معلی کے تیسرے دور (جنوری ۱۹۲۵ء تا مارچ ۱۹۴۲ء) میں تذکرۃ الشعرا کے ضمن میں ۱۷ شاعروں کے بارے میں مضامین لکھتے ہیں۔

فارسی میں شعرا کے ترجمہ لکھنے کا عام رواج رہا ہے۔ اس کے زیر اثر اردو نے اسے اپنایا، ابتدائی ادوار کے تمام تذکرے فارسی میں لکھے گئے تھے۔ یہ عجیب وغریب صورت حال مدتوں رہی کہ شعرا شاعری تو اردو میں کرتے لیکن نثر کے لیے فارسی کا سہارا لیتے۔ قدیم اہل علم کے خطوط، اردو کے دواوین اور کتابوں کے مقدمے فارسی میں ہوتے۔ سوداؔ نے مقدمہ نگاری کی نہج کو بدلا اور اردو کے اپنایا تو غالب نے اردو شاعری اور اردو میں لکھے ہوئے خطوط کے ذریعہ شہرت دوام حاصل کی۔ اردو میں شعرا کے چند ہی تذکرے لکھے گئے۔ کریم الدین کے طبقات الشعراء کے بعد محمد حسین آزاد کے آب حیات نے اس طرز کو استحکام بخشا۔

تذکرے بھی دراصل تاریخ کی شاخ ہیں۔ افراد اور اقوام کے اعمال سے تاریخ بنتی ہے۔ شعرا کی تخلیقات تاریخ کے ماتھے پر جھومر بن کر جگمگاتی ہیں۔ بادشاہوں کی تاریخ میں عوام کو تصویریں نہیں ملتیں۔ شعرا کے کلام میں عوام ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کے دل کی دھڑکنیں بھی ہوتی ہیں۔ تاریخ سے ہر دور کی ثقافت کا علم ہوتا ہے۔ شاعر ہر دور کی ثقافت کی تہذیب پروری کرتے ہیں۔ مغرب میں تذکرے کی نوعیت کی تحریریں بہت بعد کی ہیں اسے Biographical Dictionary کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ مغرب کی ندرت ہے یا مشرق کی تقلید اس بارے میں رائے دینا مشکل ہے۔

اردو شاعری جب عہد شباب کو پہنچی اس زمانے سے تذکرہ نویسی کا آغاز ہوا۔ میر تقی میرؔ خدائے سخن ہونے کے ساتھ نکات الشعرا کے مصنف بھی ہیں جسے اولیت کا شرف دیا جاتا ہے۔ نکات سخن سے آب حیات تک کے ادوار میں درجنوں تذکرے لکھے گئے وہ نہ تو تاریخ کے تقاضوں کو پورا کرتے تھے اور نہ سوانح عمری کے اصولوں کے مطابق تھے۔ ان میں اختصار کو اس حد تک ملحوظ رکھا جاتا کہ انہیں ''اسم شماری'' ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ شعرا کی ترتیب ان کے تخلص کے حروف تہجی کے اعتبار سے ہوتی۔ اس لیے ان کے زمانے کا تعین کرنا ممکن نہ ہوتا۔ ایک ہی تخلص کے کئی شاعر ہونے کی صورت میں ایک کا اموری دوسرے کے ساتھ منسوب کر دیا جاتا جو قاری کے لیے پریشانی کا باعث ہوتا۔ یہ تذکرہ نگار اپنے پیش رو کے بیان کی تکرار کرتا اور تحقیق سے دامن بچاتا۔ اوصاف شاعری مختصر ہوتے اور ان کی نوعیت ایسی عمومی ہوتی کہ کسی دوسرے شاعر کے نام کے ساتھ جوڑ دیا جا سکتا۔ آب حیات نے پرانی روش کو بدلا، اختصار کو ترک کیا، جامعیت کو ملحوظ رکھا۔ تحقیق اور تنقید دونوں شعبوں میں تحریر کے جوہر دکھائے۔ یہ اور بات ہے کہ عبارت آرائی اور داستان طرازی کے شوق کو بھی پورا کیا۔

وقت کے دھارے کے ساتھ تاریخ کا دھارا بھی آگے بڑھتا جاتا ہے۔ آب حیات نے اردو شاعری کے تراجم کو جس منزل تک پہنچایا تھا وہ حسرت کے دور میں قصہ ماضی بن چکی تھی۔ پرانے شاعروں کے بارے میں نئی نئی معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔ نئے دور کے شاعروں نے اپنی شاعری سے محفل شعر وسخن میں اجالا کر دیا تھا۔ حسرت آب حیات سے متاثر تھے اور ساتھ ہی کام کو آگے بڑھانا بھی چاہتے تھے۔ ان کا مقصد تقلید محض نہ تھا۔ انہوں نے اپنے لیے نئی راہ متعین کی۔ چنانچہ انہوں نے تذکرۃ الشعرا کا جو پہلا منصوبہ پیش کیا وہ بالکل نئے انداز کا تھا۔ اس میں سلاسل شعرا کی ترتیب میں شاعروں کو پیش کرنے کا قصد کیا۔ عموماً

یہ ہوتا تھا کہ نومشق شاعر کسی باکمال سے رجوع کرتا، شاگردی میں لیے جانے کی درخواست کرتا، شرف قبولیت حاصل ہو جاتی تو شاگرد کا رجحان استاذ کے الگ ہی شعر کہنے کی طرف ہوتا۔ شاگردوں کے سلسلے کے ساتھ رنگ سخن میں نکھار پیدا ہوتا اور ایک مخصوص دبستان وجود میں آ جاتا۔ خود حسرت موہانی، تسلیم لکھنوی کے شاگرد تھے جن کو نسیم دہلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ نسیم، مومن سے فیض پائے ہوئے تھے اس طرح مومن کا جو طرز خاص تھا اس کا سلسلہ حسرت تک جاری رہا۔ وہ ہر استاد سخن کے شاگردوں کے سلسلے کو مرتب کر کے ان کے بارے میں تذکرہ لکھنا چاہتے تھے۔ شعرائے اردو میں شاہ حاتم کے شاگردوں کی سلاسل مضبوط اور دیرپا رہی۔ ان کا فیض شاگردوں سے ہوتا ہوا حسرت تک پہنچا۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ بدنصیب میری تقی میر رہے کہ خدائے سخن ہونے کے باوجود ان کا سلسلہ تلامذہ آگے نہ بڑھ سکا۔ حسرت نے تمام اساتذہ، سلاسل کے نقشے (شجرے) بڑی محنت اور جانکاہی سے بنائے۔ اس میں شاعروں کی مجموعی تعداد لگ بھگ ڈیڑھ ہزار دکھائی اور سب کے حالات جمع کرنا اور تراجم لکھنا ایک فرد کے بس سے باہر تھا لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وہ اس منصوبے کے مطابق کام کرتے رہے اور تقریباً ۱۲۰ شاعروں کے تراجم لکھنے اور شائع کرنے میں کامیاب ہوئے۔

تذکرے کو نئے انداز سے لکھنے کے عزم کے ساتھ انہوں نے اپنے تمام تر ذرائع اور وسائل بروئے کار لا کر زیادہ سے زیادہ معلومات ہر شاعر کے بارے میں اکٹھی کیں۔ جب اس بارے میں وہ مطمئن ہو گئے تو انہوں نے معلومات کو شائع کیا۔ ان کی ملکیت میں ماقبل کے متعدد تذکرے ہیں ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ دیگر کتب اور رسائل میں شائع ہونے والے مضامین سے استفادہ کیا۔ تراجم لکھتے ہوئے انہوں نے نیک نیتی سے ان سب کے اقتباسات بھی نقل کیے اور ان کے حوالے بھی دیے۔

شاعروں کے کردار، اوصاف، اخلاق کے بارے میں حسرت کی اپنی رائے تھی جو بعد مطالعہ انہوں نے قائم کر لی تھی۔ قدیم تذکروں میں جہاں ان کے حاصل مطالعہ کے برخلاف کوئی بات نظر آئی انہوں نے اس کی تردید کی اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مثلاً مہر قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرہ مجموعہ نغز میں عبدالحی تاباں کی کردار کشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس شخص کا دستور تھا کہ شام کے وقت امردانِ شیریں ادا اور لڑکے ملیح و خوبصورت اس کے گھر سے زروزیور سے آراستہ پیراستہ ہو کر حسب الطلب امرائے قزلباش کے ہاں مہماں جاتے تھے''۔ حسرت نے اس بیان کی سختی سے تردید کی۔ اس کا استدلال ہے کہ ''ہمارے خیال میں قاسم کا یہ بیان ایک بہتان ہے جس کی کوئی اصل نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ قدیم تذکروں میں شراب نوشی کے سوا اور کوئی عیب ان کی ذات کے ساتھ منسوب ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اپنے بیان کی تائید میں انہوں نے میر تقی میر کے تذکرے سے تاباں کا حال درج کیا ہے جس میں میر نے بھی تاباں میں سوائے شراب نوشی کے کسی عیب کا ذکر نہیں کیا۔

تاباں کے حوالے سے دی تاسی کے اس بیان کو بھی حسرت نے قبول نہیں کیا ہے کہ ''۱۷۹۹ء میں وہ لکھنو میں موجود تھا لیکن بوڑھا ہو گیا تھا''۔ حسرت نے اسے مسترد کرتے ہوئے متعدد تذکروں کا حوالہ دیا ہے کہ ''کثرت شراب نوشی کی وجہ سے ان کا جوان مرجانا سب کے نزدیک مسلم ہے''۔ دی تاسی کا تاباں کو ۱۷۹۱ء میں زندہ قرار دینا اس لیے بھی غلط ہے کہ میر نے ۱۷۵۲ء میں ان کے نام کے ساتھ مرحوم لکھا تھا۔

یہ محمد حسین آزاد کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی ہے کہ ''ظفر مرحوم بذات خود کچھ نہ تھے بلکہ جو کچھ ان کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ حضرت ذوق کی تصنیف ہے''۔ آزاد کی اڑائی ہوئی آج تک عام ہے حالانکہ حسرت نے اس کی سختی سے تردید کی ہے۔ انہوں نے ذوق اور ظفر کے طرز کلام کے فرق کو واضح کیا اور ظفر کے طرز خاص کو پیش کرتے ہوئے بتلایا ہے۔ ان کے کلام میں ذوق سے کہیں زیادہ شاہ نصیر کا رنگ ملتا ہے۔ اگرچہ اس کے باوجود ظفر کے کلام میں ان کی انفرادی شان ہے جو ذوق سے بالکل مختلف ہے۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ ظفر کا کلام غمازی کرتا ہے کہ یہ آمد کا نتیجہ ہے اور ذوق کا کلام سراسر آورد اور پرتصنع فن کاری ہے۔

حسرت موہانی نے تراجم لکھتے ہوئے تحقیق کے ہر زاویے کو ملحوظ رکھا ہے۔ ان میں سوانحی حالات ہیں، پیدائش اور وفات کا حال ہے۔ ذریعہ معاش کے حوالے ہیں، طرز بود و باش کی تفصیل ہے اور پھر ان کی شاعری پر بے لاگ تبصرہ ہے۔ ان تفصیلات کے ساتھ تذکرہ مرتب کرنا انتہائی محنت اور تحمل کا متقاضی تھا۔ حسرت نے اسے پوری توجہ محنت اور انہماک سے انجام دیا۔ ان کے اکثر تراجم تفصیلی، جامع اور طویل ہیں۔ دو چار ہی مختصر تراجم ہوں گے۔ ان کے کام کی نوعیت بہت وسیع تھی۔ معلومات اور وسائل کی کمی کے علاوہ سیاسی مصروفیات تکمیل کار میں مزاحم تھیں اس کے باوجود انہوں نے پورے حوصلے اور ہمت سے اس کام کو انجام دیا ہے۔ اس سلسلہ میں داد نہ دینا اور ستائش نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ ایک عام سی بات ہے کہ جو کام نہیں کرتا اس سے صرف کام نہ کرنے کی شکایت ہوتی ہے اور کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ کام کرنے والے کے سر سو الزام آتے ہیں۔ چنانچہ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ ان کے تراجم سقم سے خالی نہیں ہیں۔ سب سے بڑی خاص یہ ہے کہ مشاہیر شعرا کے تراجم میں ضروری سنین نہیں ہیں۔ شاہ حاتم، نثار دہلوی، سعادت خان رنگین، مصطفیٰ خان شیفتہ، مائل دہلوی، حیات بخش رسا، نوح ناروی وغیرہ کے تراجم پیدائش اور وفات کے سنین سے خالی ہیں۔ تاریخ پیدائش کا معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ زمانہ پیدائش کا تخمینہ کیا جا سکتا ہے وہ بھی نہیں کیا۔ تاریخ وفات کا معلوم کرنا اس لحاظ سے آسان ہے۔ معاصر شعرا میں کسی نہ کسی نے قطعہ تاریخ وفات ضرور لکھی ہوگی یہ سب سے مستند اور معتمد ماخذ ہوتے ہیں۔ حسرت نے ان ماخذات سے استفادہ نہیں کیا۔

حسرت نے شعرا کے کوائف کے علاوہ ان کے اوصاف کی جانب بھی توجہ کی ہے جہاں تک ممکن ہوا اوصاف اپنے الفاظ میں بیان کیے لیکن زیادہ دلچسپ انداز کسی تذکرہ میں نظر آتا تو اسے نقل کر دیا ہے۔ وہ جاندار الفاظ اور موثر انداز میں شعرا کا تعارف کرواتے ہیں۔ مثلاً:

شاہ حاتم: آزاد رو، سیاہی منش، خوش مزاج، خوش خلق، ابتدا میں رندانہ مشرف کے دلدادہ تھے۔ ۱۱۴۴ھ تک رندانہ وضع پر قائم تھے۔ رفتہ رفتہ سب گناہوں سے توبہ کی اور توکل پر گزارہ کیا۔ ۱۱۵۷ھ میں فقیری اختیار کر لی تھی آزادوں کی وضع کے خلاف نیمہ پہنتے تھے۔ نماز، روزہ اور تمام احکام شرع کے سخت پابند ہو گئے مگر بانکوں کی طرح دوپٹہ سر پر ٹیڑھا ہی باندھتے تھے۔

شاہ نصیر: باوجود یہ کہ صاحب کمال تھے اور محفلوں میں اعزاز و اکرام کے صدر نشین تھے اس پر نہایت خوش مزاج اور یار باش تھے۔ بوڑھوں میں بوڑھے، بچوں میں بچے بن جاتے۔

وفا رامپوری: اخلاق و محبت کی کان تھے۔ اسلام کی ہمدردی رگ و پے میں ساری تھی۔ نہایت درجہ غیور، بامروت، بے نمود و بے ریا مسلمان تھے۔ تمام عمر پابند صوم و صلوٰۃ رہے۔ نازک مزاجی کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی اپنے خاص دوستوں سے بھی ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے مگر یہ شکر رنجی دیرپا نہ ہوتی تھی بہت جلد اور خود بخود زائل ہو جاتی تھی۔ خودداری کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی مشاعرے میں بغیر بلائے نہیں گئے اور بلائے جانے پر بھی صرف اس وقت جاتے تھے جب ان کو یقین ہو جاتا تھا کہ ان کا احترام ان کے مرتبہ، شاعری کے لحاظ سے ضرور کیا جائے گا۔

مرزا مچھو بیگ عاشق لکھنوی: دراز قامت، فربہ اندام، صحیح وشدید القوی، جسم دوقت کے اعتبار سے شاعروں میں ناسخ ثانی کے نام کے مستحق تھے رنگ البتہ ناسخ کے خلاف گندمی تھا کھلتا ہوا، دو پلی ٹوپی، انگرکھا، گھٹنا لکھنو کی معمولی وضع کا آپ کو مرغوب تھا۔ آخر عمر میں کبھی کبھی کوٹ پتلون بھی پہن لیتے تھے۔ آپ کے صلح کل اور مرنجان مرنج ہونے کی یہ حالت تھی کہ آخر وقت تک بلکہ مرنے کے بعد بھی لوگوں کو آپ کے مذہب کی اصلیت محقق نہ ہوئی کہ آپ شیعہ تھے یا سنی۔

آغا حسن ازل لکھنوی: خوش رو، وضع دار، لکھنوی کی قدیم وضع، دو پلی ٹوپی، چنا ہوا انگرکھا گھٹیلا ہوتا، بالوں میں خضاب، نہایت منکسر مزاج، اول درجہ کے خلیق تھے۔ کبھی تنہا رہنا پسند نہ کرتے تھے اور ہر وقت چاء، حقہ، پانی کا دور اور دس بیس لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔

غالب: عنفوان شباب میں مرزا شہرت کے نہایت حسین اور خوش رو نوجوانوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ بڑھاپے میں بھی ان کے چہرے اور قد وقامت سے حسن وخوبصورتی کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے تھے اور اس حالت میں بھی وہ ایک نووارد تورانی معلوم ہوتے۔

مرزا بڑے حق پسند، راست گفتار، مرنجان مرنج اور غیر متعصب تھے۔ کسی کو ان کے اصلی مذہب کی بابت اس کے اس کے سوا کچھ نہ معلوم ہوا کہ ان کو اہل بیت رسالت سے بے انتہا عشق تھا۔

باوصف ان خوبیوں کے بر بنائے آزادروی ورندانہ مزاجی مرزا کے شغل شراب اور اس کے بہت سی حکایتیں اور لطیفوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

سخن سنجی کی طرح سخن فہمی میں بھی مرزا یکتائے روزگار تھے۔ سلامتی طبع، محققانہ نظر، اور حق پسندی میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے کبھی کسی کو بے جا داد دی اور نہ کبھی قابل داد کلام سے ستائش جائز کو دریغ رکھا۔

مہر لکھنوی: حضرت مہر حد درجہ خوش خلق، خوش مزاج اور ظریف الطبع تھے۔ طبیعت صناعی کی جانب بہت مائل تھی جس چیز کا شوق رکھتے تھے اس میں کچھ نہ کچھ صفت ضرور پیدا کرتے تھے۔ کہتے ہیں لڑکپن ہی کے زمانہ میں ان پر فالج گرا تھا۔ جس کا اثر زائل کرنے کی غرض سے طبیبوں نے انہیں کنکوا اڑانے کی ہدایت کی تھی۔ اب ان کی ایجاد پسند طبیعت بھلا دوسروں کے بنائے ہوئے کنکووں سے کب خوشنود ہوسکتی۔ خود ہی کنکوے بناتے تھے اور ایسے بناتے تھے کہ دیکھنے والے حیرت میں رہ جاتے۔ مصوری اور نقاشی سے بھی ان کو ایک خاص مناسبت تھی۔ ان کی بنائی ہوئی بہت سی تصویریں قدردان فرنگ بڑے شوق سے ولایت لے گئے۔ اس پر بھی متعدد طغرے، مکانوں کے نقشے، بیلیں، لوحیں، نیز چرندوں اور پرندوں کی تصویریں اس وقت تک ان کے فرزند عبدالحکیم صاحب کے پاس موجود ہیں۔

حسرت موہانی کے تذکرے کی سب سے اہم خصوصیت شعرا کے کلام پر ان کی تنقید ہے۔ اردو میں تقریظ کا رواج رہا۔ تنقید کو ہمیشہ ممنوع سمجھا گیا۔ تہذیب، ادب اور احترام کا تقاضہ یہی رہا کہ کسی کی خامی کا ذکر کرکے اس کی دل شکنی نہ کی جائے۔ حالانکہ تنقید اس جانب دارانہ رائے کا نام نہیں ہے جس میں صرف خامی اور برائی کا ذکر ہے۔ تنقید حسن وقبح کو جانچنے اور اصولوں کے ذریعے ان کو ثابت کرنے کا نام ہے۔ قدیم تذکرہ نگار تنقیدی شعور سے کام نہیں لیتے۔ ان میں دو تذکرے البتہ ایسے ملتے ہیں جن میں تنقید کی طرف واضح رجحان ملتا ہے۔ ایک نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا تذکرہ گلشن بے خار ہے اور دوسرا محمد حسین آزاد کی آب حیات۔ شیفتہ کے ہاں سلامت روی اور غیر جانبدارانہ مطالعہ ہے سوائے اس کے کہ دو ایک شاعروں کے ساتھ انہوں نے انصاف نہیں کیا ہے۔ آزاد کی تحریر یکسر یک طرفہ اور جانب دارانہ ہے اور اکثر شاعروں کے معاملے میں تحفظات بلکہ تعصبات کے شکار رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے ذہن میں تنقید کے واضح اصول نہ تھے اور ان کے مطالعہ میں سے وسعت نہ تھی۔

حسرت موہانی تنقید کے شعبے میں ممتاز انفرادیت کے حامل ہیں۔ ان کا تنقیدی شعور وسیع مطالعہ عمیق غور وخوض پر مبنی ہے وہ ایسے شخص تھے کہ جس نے زندگی میں کبھی کتاب کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ اس کے وزن ہی سے واقف نہ تھے بلکہ اس کی قدر بھی جانتے تھے۔ وہ تنقید نگار ہیں جن کے اصول تنقید ان کے رہنے میں کہیں سے مانگے ہوئے یا مستعار لیے ہوئے نہیں ہیں۔ انہوں نے ذہن کی غلامی کبھی قبول نہیں کی۔ انہوں نے اچھے اور بری شاعری کے بارے میں اپنی رائے پی ایچ۔ ڈی کے ایک مقالہ پر ریمارکس دیتے ہوئے ظاہر کردی جس کے وہ ممتحن تھے۔ ان کا تنقیدی شعور مشرقی تہذیب، فکر اور احساس کا پروردہ ہے اس لیے ہمیں اپنی چیز معلوم ہوتا ہے۔ وہ شاعری میں صحت زبان، الفاظ کی درست دروبست، معیاری روزمرہ اور محاورہ، ندرت خیال، جدت اظہار اور ان سب سے بڑھ کر درد وتاثیر دیکھتے۔ ان اجزا کی موجودگی سے شعر آمد نہیں معلوم ہوتا الہام کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ درد وتاثیر سے عاری کلام کو شعر کہتا ہے غلط ہے وہ صرف ''کلام موزوں'' ہوتا ہے اور خواص وعوام کے پسند کے معیار سے گرا ہوا ہوتا''۔

حسرت سخن سنج بھی تھے اور سخن فہم بھی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی کا دیوان انتخاب اشعار کے لیے دیا جائے اور برسوں بعد اس عمل کی تکرار ہو تو دونوں دفعہ کے انتخاب میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ ان کا ذہن اپنے متعینہ معیار سخن کو ملحوظ رکھ کر ہر شعر کا مطالعہ کرتا اور اصولوں کے مطابق قبول یا رد کردیتا۔ انہوں نے دوسو سے زائد دواوین کے انتخاب شائع کیے۔ اس کام کے دوران انہیں کلام کے حسن وقبح کے جانچنے کا بھرپور موقع ملا۔ وہ کسی شاعر کے احوال پر بعد میں قلم اٹھاتے۔ پہلے اس کا کلام پڑھتے اور اچھے اشعار منتخب کرتے تھے۔ اس طریق کار کی وجہ سے ہر شاعر کے ترجمے میں کلام کے اوصاف کو واضح اور درست طور پر تحریر کرتے، وہ کسی شاعر کے کلام پر فیصلے صادر کرنے کے قائل نہیں۔ انہیں جو صفت بھاتی اس کا ذکر کرکے اور اپنی رائے کو ثابت کرنے کے لیے اشعار کا حوالہ دیتے جاتے۔ ان کا اندیشہ ہمیشہ تفہیم کا رہا۔ وہ اپنے نکتہ نظر کو واضح کرتے جاتے ہیں۔ اس پر اصرار نہیں کرتے۔

آیئے چند شعرا کے کلام کے بارے میں ان کی آراء سے مستفیض ہوں۔

اردو شاعری کے دور اول میں غیر فصیح الفاظ استعمال ہوئے جن سے شعر کی تاثیر کم ہوئی۔ ابہام اور رعایت لفظی سے کام لیا جاتا اس طرح شاعری لفظی کرشمہ سازی تو ہوتی اس میں کام کی کوئی بات نہ ہوتی۔ اس رجحان کو ختم کرنے اور اسے لوگوں کی پسند خاطر کے معیار پر لانے کے کام کی ابتدا شاہ حاتم نے کی۔ انہوں نے اصلاح زبان کا بیڑہ اٹھایا۔ اس معاملہ میں ان کا رویہ اتنا سخت ہوگیا کہ انہوں نے ''دیوان زادہ'' کو باقی رکھا اور ''دیوان'' کو مسترد کردیا کہ وہ ان کے معیار کا نہ تھا۔ حسرت نے ان کے کلام کا مطالعہ کرکے اس بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا ہے۔

۱۱۵۰ھ تک ان کا کلام بھی شاہ مبارک آبرو وغیرہ شعرائے طبقہ اول کے مانند زیادہ تر ابہام اور رعایت لفظی کی نمائشی خوبیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ۱۱۵۰ھ سے ۱۱۶۹ھ تک کا زمانہ گویا ان کی شاعری کا دوسرا دور ہے جس میں رفتہ رفتہ کلام عیب ابہام سے پاک اور صفائی وشستگی کے اوصاف سے متصف ہوگیا۔ یہاں تک کہ ۱۱۶۹ھ میں انہوں نے عیوب کے ساتھ ساتھ زبان قدیم کی ظاہری خرابیوں کو بھی ترک کردینے کا مصمم قصد کیا۔ چنانچہ جب قدیم الفاظ کو متروک قرار دے کر آیندہ کے لیے حتی الامکان ان

کے استعمال سے باز رہے اور اس لیے ان کے آخری عہد شاعری کی غزلیں میر و مرزا کی غزلوں سے بہمہ وجوہ مشابہت اور برابری کا دعوی کرنے لگیں۔ (اردوئے معلیٰ: نومبر ۱۹۰۹ء)

اپنے بیان کی تائید میں حسرت نے حاتم کی تینوں ادوار کی شاعری کے نمونے درج کر دیے ہیں۔ ہمارے مورخین ادب اور نقادان فن نے سعادت یار خاں رنگین کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ انہیں زیادہ تر ریختی کا شاعر ہی قرار دیا ہے۔ حالانکہ ان کی فکر بعد جہت تھی اس کی وضاحت حسرت موہانی نے یوں کی ہے:

''ہم ان کو ایک شاعر کی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو انہیں متضاد صفات کا نمونہ پاتے ہیں۔ کہیں موجد ریختی گوئی ہیں تو کہیں ناصحانہ لہجے میں بہ انداز شیخ شیراز و مولانائے روم حکایات پند آموز کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ کہیں تو عاشق دردمند کی زبان میں کہتے ہیں اور خواص وعوام سب کو اپنا گرویدہ، رنگین کلامی اور دلدادہ شگفتہ بیانی بنا لیتے ہیں اور کہیں اپنی سپاہیانہ شان میں جلوہ دکھاتے ہیں تو فرس نامہ رنگین کی صورت میں ان کے مآل سخن کے ساتھ کمال فن فروسیت کا بھی ایک نہایت قوی ثبوت پیش نظر ہو جاتا ہے۔ (اردوئے معلیٰ: فیروزی ۱۹۰۴ء)

قائم شاگردان سودا میں بلحاظ شاعری سب سے ممتاز ہیں لیکن مشہور نہیں۔ آزاد نے ان کا درجہ شاعری میں میر اور سودا کے برابر قرار دیا ہے۔ ان کے مشہور اور مقبول نہ ہونے کی وجہ حسرت نے یہ دریافت کی ہے کہ:

''انہوں نے بہت سے اساتذہ قدیم کی مانند مشغلہ سخن کو ایک مشغلۂ لطف کے طور پر اختیار کیا تھا، نہ بحیثیت ایک فن کے۔ جب فن نہ سمجھا تو انہوں نے دوسروں کو شاگرد بھی کم بنایا۔ جب انہوں نے سخن سنجی کو فن نہ تصور کیا تو لازمی طور پر انہوں نے لفظوں کی جانب زیادہ توجہ نہیں کی اور جب لطف بیان کے مقابلہ میں لطف زبان کو کم حقیقت سمجھا تو عوام میں ان کے کلام کی دل پذیری کا سکہ جم نہ سکا''۔

''عام طور پر قائم کا کلام سادہ ہے اور پُر اثر! صاف ہے اور بے تکلف! بحیثیت مجموعی میر کی غزلوں سے بہت مشابہت ہے۔ (اردوئے معلیٰ: جنوری ۱۹۰۴ء)

اردو کے شعرا میں شاہ نصیر کا درجہ سب سے بلند ہیں وہ مسلمہ استاد سخن ہیں اور ان کے شاگردوں میں ذوق، مومن، ظفر اور معروف جیسے استادان عہد گزرے ہیں۔ حسرت ان کے فن سخن طرازی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مشاقی اور پرگوئی کی شان شاہ نصیر کی ہر غزل سے پیدا ہے۔ نئی نئی زمینوں کا نکالنا اور اس کے ساتھ شگفتہ اور پسندیدہ قافیوں کا مختلف پیراؤں میں بنانا شاہ صاحب کا خاص طرز کلام ہے۔ درازئ ردیف کو اس قسم کے انداز گفتار کے لوازمات میں سمجھنا چاہیے۔ شاہ صاحب کی غزلوں میں کم ایسی ہیں جن میں یک حرفی یا ایک لفظی ردیف ہو۔۔۔ سنگلاخ زمینوں سے شاہ صاحب کو خاص انس تھا عجیب عجیب زمینیں طرح کرتے تھے، اس قسم کی زمینوں میں آپ کے کمال شاعری کو اکثر جوش آتا تھا''۔ (درووئے معلیٰ: دسمبر ۱۹۰۹ء)

ذوق دہلوی کے استاد سخن ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ ان کے کلام کی خصوصیات حسرت نے کچھ یوں بیان کی ہیں:

''کلام کی پختگی، زبان کی صحت اور محاورے کی صفائی میں ذوق کا کلام دہلی کے تمام ہم عصروں میں بدر جہا فائق ہے''۔

''لکھنو میں ناسخ کو جو مرتبہ حاصل تھا دہلی میں اس کے مالک استاد ذوق تھے۔ اگرچہ متقدمین اساتذہ دہلی کی مانند ذوق کا کلام سراسر درد و تاثیر نہیں ہے لیکن قادر الکلامی اور مشاقی کے زور سے انہوں نے بے رنگی میں بھی وہ رنگ پیدا کر دیا ہے کہ ان کے اکثر اشعار قبول عام کی سند پا کر آج تک خاص وعوام کی زبان پر جاری اور دلوں میں جاگزیں ہیں''۔

''کلام ذوق کی نسبت بحیثیت مجموعی ہم یہ رائے ظاہر کر چکے ہیں کہ وہ سراسر درد نہیں ہے لیکن اس رائے کو ان کے تمام اشعار سے متعلق نہ سمجھنا چاہیے۔ جہاں ان کی اکثر غزلیں سوز و گداز سے خالی ہیں وہیں چند ایسی بھی ہیں جن کا صاحب رنگ و تاثیر ہونا ارباب نظر کے نزدیک مسلم ہے''۔

''قصیدے کے بادشاہ تھے۔ اکبر ثانی کے دربار سے خاقانی ہند کا خطاب اسی کمال کی بدولت حاصل ہوا تھا۔ حق یہ ہے کہ ان کے ہم عصروں میں سے کسی استاد نے عام اس سے کہ وہ دہلوی ہو یا لکھنوی ان سے بہتر قصیدہ نہیں لکھا''۔ (اردوئے معلیٰ: فروری ۱۹۱۰)

حسرت نے مومن کا ترجمہ بالکل مختلف انداز میں لکھا ہے۔ وہ تذکرہ نویس سے زیادہ ماہر اصلاح سخن معلوم ہوتے ہیں۔ بے شمار اشعار لکھ کر اس میں زبان کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے لیکن اس کے باوجود وہ مومن کے اشعار کی دل پذیری کے قائل ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ناسخ کا کلام بحیثیت فن شاعری نہایت مکمل اور صحیح ہے لیکن بلحاظ لطف شاعری ملاحظہ کیجیے تو ایک گلدستہ ضرور ہے مگر کاغذی پھولوں کا۔ اس کے برخلاف مومن دہلوی کا دیوان اٹھائیں تو باوجود زبان اور فن کی لاتعداد کمزوریوں کے آپ اس میں سیکڑوں ایسے شعر پائیں گے جن کو دیکھ کر دل و دماغ کو فرحت و سرور اور روح کو کشادگی اور بالیدگی حاصل ہوگی۔ ان کے اردو کلام میں جتنی غلطیاں ہیں اتنی شاید ان کے برابر والے ہم عصروں میں کسی کے دیوان میں نہ ملیں گی۔ اگر اتنی غلطیاں لکھنو کے کسی شاعر سے سرزد ہوتیں تو اس کی نسبت کوئی استادی کا گمان بھی نہ کرتا۔ مومن کی استادی کو جس چیز نے قائم رکھا وہ ان کی فارسی زبان کے ساتھ طبعی مناسبت تھی جس کے زور پر انہوں نے ایسی غزلیں لکھ دیں جن کو دیکھ کر پڑھنے والا ان کی لغزشوں کو فراموش کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے''۔

تذکرۃ الشعرا کے ضمن میں لکھے ہوئے تراجم میں سب سے طویل ترجمہ تسلیم لکھنوی کا ہے وہ حسرت کے استاد تھے۔ بحیثیت شاگرد اگر وہ استاد کی تعریف ہی تعریف کرتے تو بھی ناگوار نہ ہوتا لیکن حسرت کی انصاف پسند طبیعت نے دیگر شعرا کی طرح ان کے کلام کا بھی گہری نظر سے جائزہ لیا اور ان کے ہر دور کے کلام کو جانچا ہے۔ انہوں نے استاد کی شاعری کے چار دور قائم کیے ہیں۔

پہلا دور	۱۲۵۵ھ تا ۱۲۵۶ھ:	اس عہد میں آپ کا قدرتی سخن نشو و نما کی حالت میں تھا۔
دوسرا دور	۱۲۶۵ھ تا ۱۲۹۷ھ:	اس دور میں حضرت تسلیم کی سخن سنجی شباب کے عالم میں تھی
تیسرا دور	۱۲۹۷ھ تا ۱۳۱۹ھ:	آثار پیری کا ظہور شروع ہو گیا۔ اسے زمانہ انحطاط قرار دیتے ہیں۔
چوتھا دور	۱۳۱۹ھ تا ۱۳۲۹ھ:	یہ حضرت تسلیم کا زوال سخن کا دور تھا۔ اس عہد کا اکثر کلام آپ کی ابتدائی شاعری کی مانند عموماً بے لطف و بے رنگ ہے۔

حسرت نے رنگ سخن بیان کرتے ہوئے ایک شاعر کا مقابلہ اور موازنہ کسی دوسرے شاعر سے بھی کیا ہے اور یا تو ان میں پائی جانے والی مماثلت ثابت کی ہے یا اختلاف واضح ہے۔ تنقید میں تقابل سے تفہیم میں مدد ملتی ہے۔

میر سوز کے ترجمے میں انہوں نے بیک وقت کئی اساتذہ کا موازنہ کیا ہے۔ اس سے ان کے مطالعہ کی گہرائی اور رائے کی

اصابت کا علم ہوتا ہے۔

''میر سوز کا کلام بے تکلف اور صاف ہے۔ اس قدر صاف کہ اکثر اس کی سادگی بے لطفی اور پھیکے پن کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ میر تقی میر کی شاعری خوبی مضمون اور صفائی بیان کے علاوہ درد کی آمیزش کی وجہ سے کامل کہلانے کی مستحق ہے۔ سودا بھی میر کے ہم پلہ ہیں۔ اگر ان کے ہاں درد میر صاحب سے کم ہے تو شوکت بیان و الفاظ اس کی تلافی کو موجود ہیں۔ خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ صرف سوز و گداز رکھتے ہیں اور میر سوز صرف سلاست بیان! اگر میر سوز کے ہاں سلاست اور صفائی کے ساتھ کچھ اور بھی ہوتا یا کم از کم یہی صفت بالنقص ہوتی تو بلاشبہ ہم انہیں میر درد کے برابر کہتے''۔ (مقدمہ دیوان میر سوز)

میر تقی میر اور مرزا سودا کے کلام کا تقابلی مطالعہ تمثیلی انداز میں کیا ہے اور خوب کیا ہے:

''میرے خیال میں شعر میر کو نشتر اور شعر سودا کو خنجر اس خیال سے کہا گیا ہے کہ جس طرح تلوار کی کاٹ نشتر کی کاٹ سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے اسی طرح شکوہ الفاظ و مضامین لطف دونوں مل کر سودا کو میر سے بڑھا دیتے ہیں لیکن جس طرح جراحت خنجر کا اثر دیر پا نہیں ہوتا کہ اس کا زخمی دم بھر میں ختم ہو جاتا ہے اور خلاف اس کے نشتر کا زخم اگرچہ بڑا نہیں ہوتا پھر بھی اس کی خلش دیر تک رہتی ہے۔ اسی طرح شعر میر کی کھٹک دل کو تڑپا دیتی ہے جو مدتوں تک تڑپاتی رہتی ہے۔ بخلاف شعر سودا کے اس کا اثر باوجود خوبی بسیار دیر پا نہیں ہوتا۔ اکثر میر و سودا کے منتخبہ اشعار ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ (اردوئے معلیٰ، نومبر ۱۹۰۳ء)

غالب اور مومن کی شاعری کے مطالعہ کے بعد حسرت نے ان میں موجود مماثلت کا ذکر کیا ہے۔

''مرزا غالب اور مومن کا انداز سخن بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ غلبہ فارسیت اور بعض موقعوں پر بلندی مضمون کی بنا پر جس طرح مرزا کے بعض اشعار بہت مشکل ہو گئے ہیں اسی طرح مومن کے بھی بعض شعر کسی صورت سے آسان نہیں کہے جا سکتے''۔

''مومن و غالب کی شاعری میں ایک اور بھی مشابہت کی صورت ہے یعنی یہ کہ جس طرح مرزا صاحب جہاں فارسی ترکیبوں سے گزر کر سہل ممتنع پر آ جاتے ہیں تو سادگی اور روانی کا دریا بہا دیتے ہیں بالکل اسی طرح مومن بھی جب چھوٹی بحروں میں صاف صاف کہتے ہیں تو قیامت ہی ڈھا دیتے ہیں''۔ (اردوئے معلیٰ، ۱۹۰۵ء)

ایک ہی دور کے تین بڑے استادان شاعری کی خصوصیات کا تقابلی جائزہ دیتے ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ''ہمارے نزدیک اردو شاعری کے لحاظ سے ذوق کا درجہ غالب سے اور غالب کا درجہ مومن سے بلند ہے۔ لیکن درد و تاثیر کلام کے لحاظ سے مومن کا کلام غالب سے افضل اور ذوق سے افضل تر ہے''۔ (ایضاً)

اردو شاعری کے مزاج اور اس کے اوصاف کو سمجھنے کے لیے حسرت موہانی کے معیار سخن اور نقد سخن کو لازماً ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اپنی سیاسی مصروفیات اور شعر گوئی میں انہماک کے ساتھ ساتھ ادب اردو اور فارسی کا گہرا مطالعہ کر کے نکات سخن اور تذکرہ لکھنا ان کا کمال ہے۔ اگرچہ وہ اپنے منصوبے کی تکمیل نہ کر سکے لیکن جو کچھ خدمت انہوں نے کی ہے وہ موجودہ زمانہ میں بڑے بڑے ادبی اداروں کی بس سے باہر ہے۔

اس لیے کا تذکرہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حسرت ادبی شان اور تحقیقی شعور کو ان کی ہمہ وقتی سیاست نے بری طرح متاثر کیا۔ انہوں نے بہت کچھ کرنے کے باوجود تذکرے کو مکمل نہیں کیا۔ ان کے تذکرے کا مطالعہ کرتے ہوئے اس میں میر، ناسخ، آتش، داغ کے احوال نہ پا کر شدید تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بھی عجیب صورت حال ہے کہ آتش اور داغ کا ذکر نہیں لیکن ان کے شاگردوں کے تراجم تذکرے میں موجود ہیں۔

آخر میں ہم ان تراجم کو پہلے منصوبے میں قائم ترتیب سے پیش کرتے ہیں اور جن شاعروں کو اس ترتیب میں پیش کرنا ممکن نہ تھا انہیں حروف تہجی کی ترتیب میں رکھا ہے۔

حصہ اول

سلسلہ شاہ حاتم

طبقہ اول: شاہ حاتم اور شاگردان شاہ حاتم

شاہ حاتم (۱)	اردوئے معلیٰ	اکتوبر ۱۹۰۳ء	ص ۳، ۴
شاہ حاتم (۲)	اردوئے معلیٰ	نومبر ۱۹۰۹ء	ص ۳ تا ۱۲
سودا مرزا محمد رفیع	اردوئے معلیٰ	نومبر ۱۹۰۳ء	ص ۱ تا ۸
بیدار، شاہ محمدی	اردوئے معلیٰ	دسمبر ۱۹۰۳ء	ص ۱ تا ۵
رنگین، سعادت یار خاں	اردوئے معلیٰ	فروری ۱۹۰۴ء	ص ۱ تا ۸
تاباں، عبدالحی	اردوئے معلیٰ	دسمبر ۱۹۱۰ء	ص ۲ تا ۷
نثار دہلوی، محمد امان	تذکرۃ الشعرا جزو دوم حصہ اول	۱۹۱۴ء	ص ۱
بقا، بقا اللہ	تذکرۃ الشعرا جزو دوم حصہ اول	۱۹۱۴ء	ص ۵، ۶

طبقہ دوم: شاگردان سودا

قائم چاند پوری	اردوئے معلیٰ	جنوری ۱۹۰۴ء	ص ۱ تا ۹
ماہر، فخر الدین خاں	اردوئے معلیٰ	دسمبر ۱۹۰۷ء	ص ۱ تا ۳
لطف، مرزا علی	اردوئے معلیٰ	اگست ۱۹۱۰ء	ص ۱ تا ۸

احسن (مرزا احسن علی) اسد دہلوی (میر امانی) محب (شیخ ولی اللہ) حسین بدایونی (معین الدین) رنگین لکھنوی (میر اکبر علی) مذنب (مرزا محمد حسن) مجذوب دہلوی (غلام حیدر بیگ) نثار دہلوی (منشی سدا سکھ) راقم دہلوی (منشی بندرابن)

(اردوئے معلیٰ: مارچ ۱۹۱۱: ص ۱ تا ۸)

شاگرد بقا

نواب بدایونی (ظہور اللہ خاں)	اردوئے معلیٰ	اپریل ۱۹۱۰ء	ص ۳ تا ۶

طبقہ سوم: شاگرد مذنب

ناصر، سعادت خاں	اردوئے معلیٰ	مارچ ۱۹۱۱ء	ص ۵، ۶

شاگردان قائم

آشفتہ رامپوری (عنبر علی شاہ) مائل (میر محمدی) شوق رامپوری (قدرت اللہ)

امیر (محمد یار خاں) کمال مانک پوری (کمال الدین)	اردوئے معلیٰ	اپریل ۱۹۱۱ء	ص ۵ تا ۸

طبقہ چہارم: شاگردان شوق رامپوری

طالب رامپوری (اللہ داد)، کرم رامپوری (کرم خاں) غفلت رامپوری (اخوندزادے احمد خاں)

صنعت رامپوری (شیخ کریم الدین)	اردوئے معلیٰ	مئی ۱۹۱۱ء	ص ۳ تا ۶
شاگردان مائل دہلوی			
صفت رامپوری (۲)	اردوئے معلیٰ	اگست ۱۹۱۲ء	ص ۲، ۳
شاہ نصیر	اردوئے معلیٰ	دسمبر ۱۹۰۹ء	ص ۱ تا ۵
آشفتہ دہلوی، عظیم الدین خاں	اردوئے معلیٰ	مئی ۱۹۱۱	ص ۳ تا ۵

طبقہ پنجم: شاگرد ناصر

حسن لکھنوی، مہدی علی خاں	اردوئے معلیٰ	مارچ ۱۹۱۱ء	ص ۶
شاگردان غفلت			
شعور (محمد سعد اللہ خاں) فرقت (برہان الدین) یاس (محمد ضیا خاں) قادر (عبدالقادر خاں) تاب، افکار (ا نرعلی خاں) حزیں (غلام محی الدین) امداد (امداد علی خاں)	اردوئے معلیٰ	مئی ۱۹۱۱ء	ص ۶، ۷
شاگرد طالب رامپوری			
افسر رامپوری (احمد یار خاں)	اردوئے معلیٰ	مئی ۱۹۱۱ء	ص ۶
شاگردان شاہ نصیر			
مومن، مومن خاں	اردوئے معلیٰ	مئی ۱۹۰۵ء	ص ۱ تا ۱۰
ظفر، بہادر شاہ	اردوئے معلیٰ	جنوری ۱۹۱۰ء	ص ۳ تا ۹
ذوق، شیخ محمد ابراہیم	اردوئے معلیٰ	فروری ۱۹۱۰	ص ۱ تا ۹
معروف، الٰہی بخش	اردوئے معلیٰ	جولائی ۱۹۱۰ء	ص ۳ تا ۹

طبقہ ششم: شاگردان ذوق

مذاق بدایونی، محمد دلدار علی	اردوئے معلیٰ	مارچ ۱۹۱۰ء	ص ۱ تا ۸
انور دہلوی، شجاع الدین	اردوئے معلیٰ	مئی ۱۹۱۰ء	ص ۲ تا ۷
ظہیر دہلوی، ظہیر الدین	اردوئے معلیٰ	جون ۱۹۱۱ء	ص ۳ تا ۱۴
شاگردان مومن			
شیفتہ، نواب مصطفیٰ خاں	اردوئے معلیٰ	اکتوبر ۱۹۰۴ء	ص ۱ تا ۸
نسیم دہلوی، اصغر علی خاں	اردوئے معلیٰ	جنوری ۱۹۰۷ء	ص ۱ تا ۹
قلق، غلام مولیٰ	اردوئے معلیٰ	دسمبر ۱۹۱۰ء	ص ۲ تا ۸
تسکین، میر حسن	اردوئے معلیٰ	جنوری ۱۹۱۳ء	ص ۱ تا ۴

طبقہ ہفتم: شاگردان ظہیر دہلوی

رونق، نواب احمد علی خاں ٹونکی	اردوئے معلیٰ	نومبر ۱۹۱۲ء	ص ۳ تا ۷
شاگرد انور دہلوی			
مائل دہلوی، مرزا محمد تقی بیگ	تذکرۃ الشعراء حصہ اول جزو دوم	۱۹۱۴	ص ۱۴، ۱۵
شاگردان داغ دہلوی			
نوح ناروی، محمد نوح	اردوئے معلیٰ	فروری ۱۹۱۱ء	ص ۹، ۱۰
بیخود بدایونی، عبدالحی (۱)	اردوئے معلیٰ	اپریل ۱۹۱۲ء	ص ۳ تا ۸
بیخود بدایونی (۲)	اردوئے معلیٰ	جنوری ۱۹۱۳ء	ص ۱ تا ۲۲
نسیم بھرت پوری، شبیر حسن	اردوئے معلیٰ	مئی ۱۹۱۲ء	ص ۳ تا ۶
حسن بریلوی، حسن رضا خاں	اردوئے معلیٰ	جون ۱۹۱۲ء	ص ۲ تا ۷
رسا، حیات بخش	تذکرۃ الشعرا جزو اول، حصہ اول	۱۹۱۴ء	ص ۱ تا ۲
وفا رامپوری، عبدالہادی خاں	اردوئے معلیٰ	مارچ ۱۹۲۵ء	ص ۱ تا ۸
شاگردان نسیم دہلوی			
شگفتہ، خیراتی لال	اردوئے معلیٰ	اگست ۱۹۰۴	ص ۱ تا ۵
اشرف کسمنڈوی، منشی اشرف علی	اردوئے معلیٰ	ستمبر ۱۹۰۴ء	ص ۱ تا ۷
مہر لکھنوی، عبداللہ خاں (۱)	اردوئے معلیٰ	ستمبر ۱۹۱۰ء	ص ۳ تا ۸
مہر لکھنوی، عبداللہ خاں (۲)	اردوئے معلیٰ	اکتوبر ۱۹۱۰ء	ص ۳ تا ۹
عاشق لکھنوی، مرزا محبوب بیگ ستم ظریف	اردوئے معلیٰ	نومبر ۱۹۱۰	ص ۳ تا ۸
تسلیم لکھنوی، امیر اللہ (۱)	اردوئے معلیٰ	جولائی ۱۹۱۱ء	ص ۳ تا ۱۲
(۲)	اردوئے معلیٰ	اگست ۱۹۱۱ء	ص ۳ تا ۱۴
(۳)	اردوئے معلیٰ	ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۱ء	ص ۳ تا ۸
(۴)	اردوئے معلیٰ	نومبر ۱۹۱۱ء	ص ۳ تا ۷

طبقہ ہشتم: شاگردان تسلیم لکھنوی

شوق نیموی، محمد ظہیر احسن	اردوئے معلیٰ	ستمبر اکتوبر ۱۹۱۱ء	ص ۸ تا ۱۳
خیالی، فخر الدین	اردوئے معلیٰ	نومبر ۱۹۱۱ء	ص ۸ تا ۱۲
عرش گیاوی، نصیر الدین احمد	اردوئے معلیٰ	دسمبر ۱۹۱۱ء	ص ۳ تا ۵
حاذق رامپوری، غلام حضرت خاں	اردوئے معلیٰ	جنوری ۱۹۱۲ء	ص ۳ تا ۵
شاگرد مشیر دہلوی			
تنویر دہلوی	اردوئے معلیٰ	جون ۱۹۱۰ء	ص ۳ تا ۱۰

حصہ دوم

مظہر جان جاناں و شاگردان مظہر

مظہر، مرزا جان جاناں	اردوئے معلیٰ	مارچ ۱۹۰۷ء	ص ۱ تا ۱۰
حزیں دہلوی، میر محمد باقر	اردوئے معلیٰ	مارچ ۱۹۰۷ء	ص ۱۰، ۱۱
شاعر، خواجہ کمال الدین	اردوئے معلیٰ	مارچ ۱۹۰۷ء	ص ۱۱، ۱۳
حسرت، میر محمد حیات	اردوئے معلیٰ	مارچ ۱۹۰۷ء	ص ۱۳ تا ۱۵
یقین، انعام اللہ خاں	اردوئے معلیٰ	مارچ ۱۹۰۷ء	ص ۱۵

میر سوز و شاگردان میر سوز

میر سوز، آشفتہ (مرزا علی رضا قلی خاں) جان (جان عالم خاں) عیش (مرزا حسین رضا) افسوس (میر شیر علی)
حیف (لالہ موتی لال) فریاد (لالہ صاحب رائے) ترقی (آغا محمد تقی خاں)

مقدمہ دیوان سوز: ۱۹۰۵ء علی گڑھ ص ۱ تا ۸

سلسلہ مصحفی و شاگردان مصحفی

مصحفی، غلام ہمدانی	اردوئے معلیٰ	جون ۱۹۰۶ء	ص ۱۶ تا ۲۲
تنہا، محمد عیسیٰ	اردوئے معلیٰ	جولائی ۱۹۰۶ء	ص ۱ تا ۵
منتظر، نور الاسلام	اردوئے معلیٰ	اگست ۱۹۰۶ء	ص ۱ تا ۲
عیشی، طالب علی خاں	اردوئے معلیٰ	دسمبر ۱۹۰۶ء	ص ۲۹، ۳۰
شہیدی، میر کرامت علی	اردوئے معلیٰ	اگست ۱۹۰۷ء	ص ۱ تا ۸
شاگرد آتش: صبا، میر وزیر علی	اردوئے معلیٰ	اگست ۱۹۰۷ء	ص ۱ تا ۸
شاگرد صبا: کیف، شیخ فضل احمد	اردوئے معلیٰ	اپریل ۱۹۰۸ء	ص ۱ تا ۱۰
:ازل، حکیم آغا حسن	اردوئے معلیٰ	نومبر ۱۹۰۶ء	ص ۱ تا ۳

غالب و شاگردان غالب

غالب، مرزا اسد اللہ خاں	مقدمہ دیوان غالب، مطبوعہ دہلی	۱۹۰۵ء	ص ۳ تا ۱۸
سالک، قربان علی بیگ	محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ	اپریل ۱۹۰۲ء	ص ۱ تا ۱۴
مجروح، میر مہدی (۱)	اردوئے معلیٰ	جولائی ۱۹۰۳ء	ص ۴۶، ۴۷
(۲)	اردوئے معلیٰ	ستمبر ۱۹۰۵ء	ص ۱ تا ۷
(۳)	اردوئے معلیٰ	اکتوبر ۱۹۰۵ء	ص ۴۵، ۴۶
شعلہ، بنواری لال	اردوئے معلیٰ	ستمبر ۱۹۱۲ء	ص ۳ تا ۷
حالی، الطاف حسین	تذکرۃ الشعرا: حصہ اول جزو پنجم	۱۹۱۵ء	ص ۳ تا ۲۰

حصہ سوم

شعرا بہ ترتیب حروف تہجی

آباد عظیم آبادی، شیخ علی باقر	اردوئے معلیٰ	فروری تا جون ۱۹۳۱ء	ص ۳، ۴
ابجدی دکنی، میر محمد اسماعیل	اردوئے معلیٰ	جنوری ۱۹۳۱ء	ص ۳
امیر لکھنوی، پنڈت بشن نرائن در	اردوئے معلیٰ	جنوری ۱۹۳۱ء	ص ۴ تا ۷
اثر عظیم آبادی، سید امداد امام	اردوئے معلیٰ	جولائی اگست ۱۹۳۱	ص ۳
اختر، قاضی محمد صادق	مجموعہ مثنوی مطبوعہ علی گڑھ	۱۹۰۵ء	ص ۲، ۳
ثاقب اکبر آبادی	تذکرۃ الشعرا، حصہ اول جزو پنجم	جولائی ۱۹۱۵ء	ص ۲۰ تا ۲۵
جرأت، شیخ قلندر بخش	مقدمہ دیوان جرأت، مطبوعہ کانپور	۱۹۲۸	ٹائٹل کی پشت پر
چکبست پنڈت برجے نرائن (۱)	اردوئے معلیٰ	مارچ ۱۹۲۶	ص ۴
(۲)	اردوئے معلیٰ	اپریل تا جون ۱۹۲۶ء	ص ۳ تا ۶
حبیب کنتوری، سید محمد کاظم	اردوئے معلیٰ	اپریل ۱۹۰۸ء	ص ۱ تا ۱۰
راسخ عظیم آبادی، شیخ غلام علی	اردوئے معلیٰ	مئی ۱۹۰۷ء	ص ۱ تا ۷
سحر لکھنوی، شیخ امان علی	اردوئے معلیٰ	ستمبر ۱۹۰۷ء	ص ۱ تا ۸
شبلی نعمانی (۱)	تذکرۃ الشعرا حصہ اول، جزو چہارم	اپریل تا جون ۱۹۱۵ء	ص ۱۹ تا ۲۴
شمس لکھنوی، سید آغا علی	مجموعہ مثنوی مطبوعہ علی گڑھ	۱۹۰۵ء	ص ۴
گستاخ رامپوری، کرامت اللہ خاں	تذکرۃ الشعرا حصہ دوم (جزو دوم و سوم)	۱۹۱۹ء	ص ۱ تا ۵
محبت، محبت خاں	مجموعہ مثنوی مطبوعہ علی گڑھ	۱۹۰۵ء	ص ۱۴، ۱۵
مست بنارسی، سید عبد المجید	تذکرۃ الشعرا حصہ اول جزو پنجم	جولائی ۱۹۱۵	ص ۲۶، ۲۷
مصباح المغنی مجددی	اردوئے معلیٰ	جولائی ۱۹۳۷ء	ص ۲، ۳
منیر شکوہ آبادی، میر اسماعیل حسین	محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین	جنوری ۱۹۰۲ء	ص ۷ تا ۲۲
میر حسن، میر غلام حسن	اردوئے معلیٰ	اپریل ۱۹۰۷ء	ص ۱ تا ۸
نظم طباطبائی، علی حیدر	اردوئے معلیٰ	مئی جون ۱۹۳۳ء	ص ۱ تا ۶

پاکستان میں تحقیق کی موجودہ صورتِ حال

ڈاکٹر سلیم اختر

پاکستان میں تحقیق کی موجودہ صورت حال بھی وہی ہے جو پاکستان کے تعلیمی اداروں، جامعات، علمی مجالس، سیاست، ادب، عدلیہ، مقننہ اور افراد و اشخاص کی ہے یعنی سرعت سے زوال کی سیڑھیاں اتری جا رہی ہیں۔ شاید ہی کسی قوم نے ہماری مانند نصف صدی میں اس تیز رفتاری سے منفی کا سفر طے کر کے انحطاط کے عمل کا آغاز کیا ہوگا۔ انحطاط کا وہ عمل جسے ''انجام کے آغاز'' (Begining of the End) سے موسوم کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ ہم نے تو خار نہ بوئے، کانٹوں کی فصل ہمارا مقدر کیوں؟ ہم کیوں خار بداماں ہوئے؟ اور کانٹوں کا تاج پہنایا گیا؟

حالات کے تختے اعصابی کمزوری کی پیدا کردہ پژمردگی پر مبنی اس منفی تمہید سے صرف نظر کرتے ہوئے مقالہ کے موضوع پر بات کریں تو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آج پاکستان میں تحقیق کی صورت حال ایسی دل خوش کن نہیں کہ اس پر فخر کیا جا سکے لیکن تاسف کی اس لیے ضرورت نہیں کہ میر تقی میر کے ''صعب عاشقی'' کی مانند تحقیق ہر (پڑھے لکھے) شخص کے بس کا روگ بھی نہیں۔ جس طرح فزکس، ریاضی، موسیقی، مجسمہ سازی، مصوری وغیرہ یا آتی ہیں یا نہیں، ٹیوشن کے ذریعے سے ان میں فضیلت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ جس طرح شاعری ارفع ہو کر پیغمبری کا جزو بن سکتی ہے اسی طرح تحقیق اپنی اعلیٰ تر صورت میں دریافت اور انکشاف کی بدولت سائنس بن سکتی ہے۔ اعلیٰ تحقیقی بصیرت، ژرف نگاہی، تجزیہ و تحلیل کے ذریعہ سے نامعلوم کو معلوم بنا کر محقق بھی سائنس دان کا ہم پلہ ثابت ہو سکتا ہے لیکن اور یہ ''لیکن'' قابل توجہ ہے کہ ہمارے پاس سائنس دانوں کے پایہ کے کتنے محققین ہیں؟ یقین کیجیے ایک ہاتھ کی انگلیوں پر بھی ان کے اسماء نہیں گنے جا سکتے۔ کیا آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ یہ گنتی کے جو چند محققین ہیں صرف یہی گذشتہ نصف صدی سے معروف چلے آ رہے ہیں۔ اسی سے تحقیق کی موجودہ صورت حال کا اندازہ لگا کر مستقبل پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

میں مقالہ کو کلاس لیکچر میں تبدیل کرتے ہوئے نہ تو تحقیق کی لغوی تعریف کروں گا نہ آلات تحقیق کی تشریح اور نہ ہی تحقیقی مقالہ کے اسلوب کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی وضاحت کروں گا۔ تاہم محقق کے اوصاف بلکہ اوصاف حمیدہ کی طرف توجہ دلانے کی اجازت چاہوں گا کہ عمل تحقیق محقق کی شخصیت سے مشروط ہوتا ہے۔

فرائیڈ نے تخلیقی شخصیت کی اساس ابنارمل کردار پر استوار کی تھی مگر فرائیڈ کے برعکس، محقق کو نارمل انسان قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ نہ تو شاعر کی مانند اس پر الہامی کیفیات کا نزول ہوتا ہے اور نہ ہی تخلیقی عمل کے دوران وہ وجدانیت کے نئے آفاق کے ذریعہ آگہی کی نئی منزلیں سر کرتا ہے۔ شعر سرزد ہو سکتا ہے مگر تحقیق سرزد نہیں ہو سکتی کہ تحقیق کی شریعت میں یہ کفر کے مترادف ہے۔

(صلہ و ستائش کی تمنا کے بغیر) علمی لگن (فراہمی مواد کے لیے) مسلسل محنت (عمل تحقیق میں) مستقل مزاجی (اخذِ نتائج میں) دیانتداری۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے..... محقق!

ماہرین نے محقق کی دیگر خصوصیات کی بھی فہرست مرتب کی ہے لیکن ان چار خصوصیات میں دیگر خصوصیات بھی شامل سمجھی جا سکتی ہیں کہ وہ ضمنی اور یہ اساسی ہیں۔ شاید یہ معیار کڑا نظر آئے لیکن محقق کے لیے ایسا ہی معیار ہونا چاہیے کہ علامہ اقبال کے زمانہ کی مانند:

تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ

تحقیق کار کم حوصلہ نہیں اس لیے آسان نہیں۔ اسے اس مثال سے سمجھیے کہ محقق ناقد ہو سکتا ہے مگر ہر ناقد کا محقق ہونا دشوار ہے۔ طبعی مناسبت اور تحقیقی میلان کے بغیر محقق نہیں بنا جا سکتا۔ محقق تو بنا بنایا تحقیق کے سانچہ میں ڈھلا ہوتا ہے۔ یا محقق ہوتا ہے یا نہیں، درمیان کی کوئی صورت نہیں۔ تربیت اور مطالعہ سے طبعی صلاحیت جلا پا سکتی ہے لیکن اس کا فقدان ہو تو مطالعہ، تربیت بلکہ ایک بڑا کتب خانہ بھی محقق نہیں بنا سکتا۔ ممکن ہے کہ وہ ایک اچھا مرتب ثابت ہو لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ تب حوالوں کے انبار لگا دینے کے باوجود بھی مرتب جستجو کی لذت اور ایج کی حلاوت سے محروم رہتا ہے۔

افلاطون کے بموجب فنون لطیفہ کی سرپرست ۹ دیویاں Muses جب تک کسی کو اپنی سرپرستی میں لے کر اس میں ربانی دیوانگی نہ پیدا کر دیں وہ تخلیق کار نہیں بن سکتا۔ محض محنت، تربیت، مشق یا مطالعہ کی مدد سے حقیقی تخلیق کار نہیں بنا جا سکتا۔ افلاطون کی ہم نوائی میں ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک سر میں تحقیق کا سودا نہ سمائے، محقق نہیں بنا جا سکتا مگر حقیقی سودا اور سودائے خام میں امتیاز کیسے ہو؟

میرے خیال میں اس کا جواب محقق کی تحقیق ہی میں پوشیدہ ہے اگر وہ اپنی تحقیق سے دریافت اور انکشاف نہیں کرتا، اگر روپوش حقائق سے پردہ نہیں اٹھاتا، اگر مروج کذب، غلط حاشیے، منفی آراء، بے بنیاد الزامات وغیرہ کی اصل اور اساسی حقیقت واضح نہیں کرتا اور اگر اس کے آلات تحقیق صرف گوند اور قینچی تک محدود ہیں اور وہ دوسروں کے خوب صورت اقتباسات سے اپنی نالائقی چھپانے کے لیے نظر بندی جیسا کام کرتا ہے تو وہ شعبدہ باز تو ہو سکتا ہے سچا اور کھرا محقق نہیں۔ لہٰذا ایسے کاذب محقق کے دعوے تحقیق کے جواب میں یہ کہہ دینا ہی کافی ہے:

یہ کہہ دو دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا

تحقیق تلاش حق کا علم ہے لہٰذا محقق حق کا جادہ پیما ہوتا ہے مگر حق کی جادہ پیمائی سہل نہیں کہ اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ بعض امور کے لحاظ سے تو محقق بھی جاسوس کی مانند، جاسوسی کرتا اور نامعلوم کو معلوم کی روشنی میں لاتا ہے۔ تحقیق انکشاف ہے اسی لیے محقق معلومات و کوائف کی درستی اور معیار بندی سے معلوم حقائق کی توثیق یا تردید کرتا ہے۔ محقق کی دریافتیں اور انکشافات تاریخ ادب کو باثروت بناتے ہیں۔ ساتھ ہی محقق ادبی شخصیات کے احوال و آثار کو اپ ٹو ڈیٹ بھی کرتا ہے۔ اس عمل میں مخطوطہ شناسی، متن کی درستی، تعلیقات، تخریج، تقابلی تحقیق وغیرہ بہت کچھ شامل ہے۔ لسانیات سے وابستہ امور، مباحث، نزاعات اور معلومات و کوائف وغیرہ کا بھی اس ضمن میں ذکر کیا جا سکتا ہے جبکہ فراموش کردہ شخصیات، نایاب کتب، گمشدہ عہد کے واقعات کے بارے میں بھی جستجو محقق ہی کرتا ہے۔

تحقیق کے وسیع کل میں ادب و نقد، شخصیات و کتب، عمرانی معلومات اور تاریخی کوائف بھی شامل ہیں اس لیے اصولاً تو تحقیق کی اقسام یا ذیلی شعبوں میں تقسیم نہ ہونی چاہیے لیکن سہولت کے لیے اگر درجہ بندی مقصود ہو تو اسے لسانیات، مخطوطہ شناسی،

متن، مآخذ کی درستی، اصطلاحات کے درست مفہوم کا تعین، شخصیات، کتب، اصناف سے وابستہ معلومات و کوائف کی فراہمی و درستی اور معیار بندی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

مآخذ کی تصحیح بے حد اہم ہے کہ سب کچھ کہہ سن کر تحقیق حوالوں کا کھیل بلکہ بعض اوقات تو حوالوں کی لڑائی بھی ثابت ہوتی ہے۔

محقق قدیم و جدید علوم سے استفادہ کرتا ہے اس لیے علوم سے وابستہ مفاہیم میں قطعیت کے ساتھ ساتھ اردو میں ان علوم کی اصطلاحات کے درست تراجم کے ساتھ ساتھ دیگر علمی اصطلاحات کے استعمال کی مختلف، صحیح اور غلط صورتوں کو اجاگر کرنا بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

جہاں تک اردو تحقیق سے وابستہ اساسی مباحث کا تعلق ہے تو بلاشبہ ان میں لسانیات کو سرفہرست قرار دیا جا سکتا ہے۔ اردو تحقیق کی درخشندہ شخصیات نے لسانیات میں اپنے جوہر دکھائے اور ان ہی کی تحقیقات نے اردو میں لسانیات کے نئے مباحث چھیڑے اور ان ہی شخصیات نے نظریہ سازی بھی کی۔

اردو لسانیات میں جن مسائل پر سب سے زیادہ توجہ دی گئی وہ یہ ہیں (۱) لفظ اردو کی تحقیق اور (۲) اردو زبان کی پیدائش اور ابتدائی نشوونما سے وابستہ مباحث۔

اردو کی پیدائش کے سلسلہ میں دو اساسی رجحانات ملتے ہیں۔ کسی خاص خطہ کو اردو کی جنم بھومی قرار دینا جیسے پنجاب (حافظ محمود شیرانی) سندھ (سید سلیمان ندوی) دکن (نصیر الدین ہاشمی) یہ تو آغاز کی نظریہ سازی تھی لیکن بعد میں اس ضمن میں اتنا غلو ہوا کہ پاکستان اور ہندوستان کے ہر صوبہ ہی کو اردو کا مولد قرار دے دیا گیا۔

دوسرا رویہ یہ ہے کہ کسی خاص خطہ سے تعلق جوڑنے کے برعکس اردو زبان کی اساسی ساخت کو بنیاد بنا کر اس کی تشکیل کے بارے میں نظریہ سازی کی گئی۔ اس ضمن میں نظریات کا خاصہ تنوع ملتا ہے۔ آپ ان نظریات سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن ہیں یہ دلچسپ۔ مثلاً ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو کی اساس قدیم ویدک بولیوں پر استوار کی تو عین الحق فرید کوٹی نے دراوڑی سے اس کا ناتہ جوڑا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اسے مرہٹی کی سگی بہن کہا۔ الغرض ان ماہرین نے اردو کو کسی خاص جغرافیائی خطہ سے منسوب کر دینے کے برعکس زبان کی تشکیل سے وابستہ امور پر توجہ دی۔

گلشن تحقیق کی زیادہ تر رونق بھی (بصورت اعتراضات، تردید، نزاعات، استدلال، شواہد) ان ہی نظریات و تصورات کی وجہ سے رہی ہے مگر اب یوں محسوس ہو رہا ہے کہ لسانی مباحث کا دور تمام ہوا۔ اردو کے نام اور آغاز کے بارے میں جو کچھ کہا جا سکتا تھا اور جس نوع کی تحقیقات ہو سکتی تھیں، وہ تمام ہوئیں۔ نئے مباحث ختم ہوئے تو گویا لسانیات کے دروازہ پر بھی تالا پڑ گیا۔ آج کے محقق کے پاس ایسے شواہد کا فقدان ہے جن کی شکتی سے وہ کھل جا سم سم کہہ کر بند دروازہ کھول سکے اس لیے آج لسانیات پر قلم اٹھانے والے بنیادی کی بجائے ثانوی مآخذ پر انحصار کر رہے ہیں کہ اب لسانی تحقیق بنیادی مآخذ کی جستجو کے برعکس معروف محققین کے خوب صورت اقتباسات حاصل کرنے تک محدود ہو چکی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب ہماری لسانیات ایک طرح سے Isolated ہو چکی ہے، ان معنی میں کہ آواز کی ماہیت، حرف کی صوتی ساخت، زبان کے عمرانی پہلو، اس کی نفسیاتی اساس اور ان سب کی تشکیل میں اساطیر اور اینتھروپولوجی کے کردار سے آج کے لسانی محققین کو کوئی خاص رغبت نہیں اور یہ جو ساختیات، پس ساختیات وغیرہ پر ان دنوں مقالے باندھے جا رہے ہیں تو یہ محض انگریزی کتابوں کی تلخیص ہیں۔ ان کی روشنی میں اردو اصوات، حروف، الفاظ اور پھر زبان کی داخلی ساخت اور اس کے خارجی مظاہر کا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ بس دریدہ کا ایک قول سونٹھ کی گانٹھ بنا لیا گیا۔ مصنف تحریر نہیں لکھتا، تحریر مصنف کو لکھتی ہے اور قاری تحریر نہیں پڑھتا، تحریر قاری کو پڑھتی ہے۔ سا سیر اور ویٹگنائن وغیرہ کے اقوال کے بارے میں تشریحی نوعیت کے مضامین تو چھپتے رہے لیکن ان سے اردو لسانیات میں نئے مباحث کے دروانہ ہوئے۔ اسی لیے آج کی اردو لسانیات میں کوئی نظریہ ساز محقق نظر نہیں آتا۔

میں اس بات کا قائل ہوں کہ اب غیر ملکی ماہرین کے نظریات و تصورات کے خلاصے بیان کرنے کے مقابلہ میں اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کے باہمی لسانی روابط اجاگر کرنا زیادہ ضروری ہے۔ اس ضمن میں کچھ کام ہوا بھی ہے جیسے خاطر غزنوی (ہندکو) شرف الدین اصلاحی (سندھی) مہر عبدالحق (ملتانی) ڈاکٹر طاہر تونسوی (سرائیکی) اس انداز پر دیگر پاکستانی زبانوں اور اردو کی تقابلی لسانیات کی صورت میں حرف سازی، لفظی اشتراک اور زبانوں کی اساسی ساخت میں مماثلت تلاش کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔

جس طرح ہر فن، ہنر اور صنعت کے لیے مخصوص آلات ہوتے ہیں اسی طرح محقق کے آلات کی فراہمی کا انحصار کتب خانہ (ذاتی یا دیگر) پر ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اچھے اور معیاری کتب خانے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس ضمن میں ہندوستان کو ہم پر فوقیت حاصل ہے۔ وہاں قدیم زمانوں کے ذاتی اور سرکاری کتب خانے خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ وہاں خدا بخش لائبریری (پٹنہ) جیسی اور بھی لائبریریاں مل سکتی ہیں، ہمارے ہاں نہیں۔ دو چار بڑی جامعات سے قطع نظر صرف مسعود جھنڈیر کی لائبریری نظر آتی ہے جو اب علم کی موجزن ندی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس موقع پر (مرحوم) مشفق خواجہ کو بھی احسان مندی سے یاد کرنا ضروری ہے جنہوں نے ذاتی کتب خانہ کو سبیل میں تبدیل کر دیا۔

مخطوطوں اور قدیم و نایاب کتب کا جتنا بڑا ذخیرہ دہلی، لکھنو، رام پور، حیدر آباد، علی گڑھ، پٹنہ میں ہے اس کا عشر عشیر بھی ہمارے ہاں نہیں۔ ہم سے زیادہ ذخیرۂ نوادر تو انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں ہوگا۔

ہمارے بھانت بھانت کے حکمرانوں نے کتب خانوں کو ہمیشہ ''غیر ترقیاتی اخراجات'' سمجھا۔ لہذا کبھی بھی کتب خانوں کی طرف توجہ نہ دی گئی، یوں ہمارے ہاں کتاب کلچر نے فروغ نہ پایا۔ کتب خانے نہیں تو تحقیق کے لیے مواد کہاں سے حاصل ہوگا؟ پاکستان کے قدیم خاندانوں کے پاس جو مخطوطات، فرامین، تصاویر اور نایاب کتب ہیں، اگر ان لوگوں کو معقول معاوضہ ادا کر کے حکومت ان سے یہ نادر مواد حاصل کر کے جدید انداز کا ایک کتب خانہ قائم کر دے تو علم و ادب اور نقد و تحقیق کے لحاظ سے یہ بڑی خدمت ہوگی۔ لیکن نو من تیل کہاں، نو من تیل تو اسلام آباد بہہ گیا جہاں نیشنل اسمبلی کے سپیکر کے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ روپے کی بلٹ پروف کار خریدی جاتی ہے۔

ہم نے کبھی بھی اس امر کا شعوری طور پر ادراک نہ کیا کہ معاصر تحقیق کے موضوعات، انداز اور اسلوب کے تعین میں جامعات کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ گنتی کے چند محققین ہی شوقیہ محقق ہوں گے بقیہ تمام محققین کا جامعات یا کالجز سے تعلق ہوتا ہے۔ یہ جامعات کی عطائے خسروانہ ہے کہ ہم افراط زر کی مانند افراط تحقیق کا بھی شکار ہیں۔ یاروں نے تحقیق کے نام پر دس دس کلو کے ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقی مقالے باندھے بلکہ اتنے باندھے کہ اب تحقیق کے لیے معقول موضوعات ہی نہیں رہے۔ لہٰذا اب ''احوال و آثار'' والے مقالات تحریر ہو رہے ہیں۔ ڈھنگ کی شخصیات نہ بچیں اس لیے تازہ مرحومین کی تاک میں رہتے ہیں۔ مرحوم کا کفن میلا نہیں ہوتا کہ ہر جامعہ میں اس کے ''احوال و آثار'' پر مبنی مقالہ کا خاکہ جمع کرا دیا جاتا ہے۔

تحقیق کی تعریف کے بموجب، تحقیق اگر نامعلوم کو معلوم کرنے کے عمل کا نام ہے جس کا اختتام دریافت اور انکشاف پر ہو تو پھر ڈاکٹریٹ کے لیے قلم بند کیے گئے ایسے (بلکہ اب تو ایسے ویسے) مقالات تحقیق کے برعکس محض شخصی مطالعات قرار پاتے ہیں۔ لہٰذا مقالہ نگار کو محقق کے بجائے صرف معلومات وکوائف جمع کرنے والا قرار دیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر نہیں، صرف کمپاؤنڈر!

چلیں ایسے مقالات میں تو حصول مواد کے لیے سعی کی جاتی ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اب تو شخصیات اور جراید کی کتابیات، تعلیقات اور اشاریے بھی ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیق میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ کتابیات، تعلیقات اور اشاریہ آلات تحقیق میں شمار ہوتے ہیں انہیں تحقیق کا مرتبہ کیسے حاصل ہو گیا؟ جزو کل میں تبدیل ہو گیا؟ کوچہ شہر قرار پایا اور گل گلستان بن گیا۔ یہ ہے جامعات کا چمتکار!

جریدہ کی فائل سامنے رکھ کر، کارڈ بنا لیے، مقالہ مکمل، کہاں کی تحقیق؟ یہ تو ایسی تحقیق ہے جس میں ہر لحاظ سے محققانہ مساعی کی نفی ہو جاتی ہے۔ اسے تو اونچے درجہ کی کلرکی کا درجہ بھی نہ ملنا چاہیے۔ اسی انداز کے مقالات کی بنا پر اب یہ سوال پوچھا جا رہا ہے:

— کیا ڈاکٹریٹ کا مقالہ محقق بنا سکتا ہے؟

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ تحقیق کا فرسودہ فارمولا مسترد کر کے، تحقیق کے لیے جدید سوچ پر مبنی ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جائے جن میں واقعی تحقیق کا رس ہو۔ ہمارے ہاں ہنوز اقتباسات جمع کر دینے ہی کو تحقیق سمجھا جا رہا ہے اور اسے بھی اس صورت میں جبکہ بنیادی مآخذ اور ثانوی مآخذ میں امتیاز کرنے کا سلیقہ بھی نہیں۔

جامعات سے وابستہ تحقیق میں صدر شعبہ اردو اساسی کردار ادا کرتا ہے۔ کسی بھی جامعہ میں، صدر شعبہ کی مرضی، پسند، ناپسند، تعصبات، خیالات، نظریات، ذاتی نفرت اور سیاسی وابستگی سے جو معیار تحقیق طے پا جاتا ہے اس کی علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی کسوٹی پر ہی تحقیقی مقالہ لکھنے والے طلبہ یا ڈاکٹریٹ کے امیدوار کو پورا اترنا پڑتا ہے۔ متعدد اچھے موضوعات محض اس لیے مسترد ہو جاتے ہیں کہ وہ صدر شعبہ کی علمی استعداد سے ماورا ہوتے ہیں۔ لیکن وہ معصوم انسان بھی کیا کرے؟ صدر شعبہ نے جیسا نصاب پڑھا، جیسے اساتذہ سے پڑھا، جس تعلیمی ماحول میں تدریس حاصل کی اور جس نظام کے تحت خود ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ یہ سب اس کی علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی حس بلکہ حسیات کی کنڈیشنگ کا باعث بنتے ہیں۔

اس تناظر میں، کسی بھی جامعہ کے کسی بھی صدر شعبہ کا نام ذہن میں لائیے، پھر اس نے تحقیقی مقالات کے لیے جس طرح کے موضوعات منظور فرمائے ان پر غور کیجیے تو میری بات سمجھ میں آ جائے گی۔ اگر بیشتر تحقیقی مقالات کا یہ عالم نظر آئے۔ نہ سوختنی نہ فروختنی۔ تو بڑی حد تک صدر شعبہ ہی اس کا ذمہ دار ہے، اس کے باوجود اسے صدر شعبہ کی کوتاہی یا نالائقی نہ سمجھنا چاہیے کہ ہماری جامعات کی تعلیمی فضا تدریسی اسلوب اور نصاب ایسے ہی پروفیسرز اور صدر شعبہ سانچہ میں ڈھال سکتا ہے۔

ان سب پر مستزاد ہماری جامعات میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں، صدر شعبہ VS، جونیئرز، کمیٹیوں کا بے سروپا نظام، کلرکوں کی کرپشن، کنٹرولر امتحانات کی تساہل پسندی اور وائس چانسلرز کی ان امور سے عدم دلچسپی الغرض! منفی کی طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔ حلقۂ صد کام نہنگ اور قطرے کے گوہر بننے تک کے مراحل۔

مرزا ابن حنیف کی تصانیف

پ: ۳۰ نومبر ۱۹۳۰ء وفات: ۲۹ جولائی ۲۰۰۴ء

سمیرا حمریں

۱۔ ہزاروں سال پہلے، ابواب آٹھ (ناشر اور مقام اشاعت؟) ص ۲۶۲

۲۔ جلجامش کی داستان، مکتبہ معین الادب لاہور، ۱۹۶۰ء۔ دوسرے ایڈیشن کا نام ''دنیا کی پہلی داستان''، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵۱

۳۔ بھولی بسری کہانیاں، ادب مرکز، کرشن نگر، لاہور: جولائی ۱۹۶۴ء (تین حصوں میں یک جلدی کتاب)، ص ۳۰۷

۴۔ تخلیق کائنات۔ کوہ نور پبلی کیشنز: شاہ عالم مارکیٹ لاہور: (کتاب کے دو حصے، یک جلدی کتاب)، ص ۱۸۸

۵۔ سات دریاؤں کی سرزمین، کاروان ادب، ملتان: اکتوبر ۱۹۸۰ء، ص ۲۶۴

۶۔ مصر کی قدیم مصوری، کاروان ادب، ملتان: نومبر ۱۹۸۱ء، ص ۱۸۴

۷۔ دنیا کا قدیم ترین ادب۔ (دس ابواب پر مشتمل) کاروان ادب، ملتان: ۱۹۸۲ء، ص ۷۶۸

۸۔ بھولی بسری کہانیاں (شمار ۳ کی مفصل شکل) جلد اول، بیکن بکس گلگشت، ملتان: فروری ۱۹۹۰ء
ایضاً، جلد دوم فروری ۱۹۹۹ء، ص ۱۸۸
ایضاً، جلد سوم (۱۹ ابواب میں)، سنہ؟، ص ۱۰۴

۹۔ مصر کا قدیم ادب (چار جلدوں میں) جلد اول (۱۵ ابواب) بیکن بکس گلگشت، ملتان: سنہ؟ ص ۶۸۰
جلد دوم (مذہبی لوگ) سنہ؟، ص ۷۵۶
جلد سوم (مصر کا قدیم ادب)، ۱۹۸۶ء، ص ۶۸۸
جلد چہارم، ۱۹۹۶ء، ص ۸۰۴

۱۰۔ جنوبی ہند کے آثار قدیمہ، (پانچ ادوار) بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی سرائیکی سنٹر ملتان: ۲۰۰۳ء، ص؟

۱۱۔ مار پرستی (آخری کتاب، مسودہ) غیر مطبوعہ

۱۲۔ بابلی ادب (آخری کتاب، مسودہ) غیر مطبوعہ

(''مرزا ابن حنیف کی شخصیت اور علمی آثار'' مطبوعہ قومی زبان کراچی، اکتوبر ۲۰۰۴ء سے ماخوذ)

عباداللہ اختر اوران کی تصانیف

ناز شوکت علی

میرے دادا خواجہ عباداللہ اختر (امرتسری) ایک مطبوعہ خاندانی یادداشت کے مطابق سال ولادت ۱۸۷۶ء ہے[1]۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۵۹ء کو جہلم میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

خواجہ صاحب نے اپنی کتاب ''عجمی مذاہب کا اثر مسلمانوں کے عقائد پر'' میں اپنے متعلق صفحہ ۶۰ پر لکھتے ہیں:

''میری پیدائش و پرورش اور تعلیم و تربیت امرتسر (پنجاب) میں ہوئی۔ یادش بخیر اب یہ ''گرو کی نگری'' بھارت میں تقسیم ہند کے بعد شامل ہو چکی ہے''۔

بڑے ابا جی (عباداللہ اختر) کا تعلق منٹو خاندان سے تھا۔ اپنے نام کے ساتھ منٹو نہیں لکھتے تھے۔ صرف امرتسری لکھتے تھے۔ اپنی ایک غیر مطبوعہ کتاب (جس کا مسودہ میرے پاس موجود ہے) میں اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں بھی ایک مہاجر ہوں۔ میری اور میرے لواحقین کی املاک واقع امرتسر اور دین نگر ضلع گورداسپور میں لاکھوں کی مالیت کی تھیں۔ وہ سب ہاتھ سے جاتی رہیں''۔

میرے والد (خواجہ کرامت اللہ قمر) اور پھوپھی (محمودہ اختر) کہا کرتے تھے کہ مذہبی تعلیم بڑے ابا جی نے بابا خلیل احمد سے حاصل کی تھی۔ ان کے علاوہ اور کسی استاد کا ذکر انہوں نے کبھی نہیں کیا۔ ذکر و شغل میں بھی ''بابا جی'' کی رہنمائی حاصل تھی۔ فرماتے ہیں:

''میں خود یہ سب ذکر و شغل کرتا رہا ہوں اور میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے کوئی ذکر و شغل ایک دو دن سے زیادہ نہ کرنے دیا۔ میں نے عرض کی کہ ''بابا جی کسی ایک شغل کو تو تمام ہونے دیں''۔ فرمایا ''بیٹا میرا مقصد یہ نہیں کہ تم ان اشغال میں وقت ضائع کرو۔ لیکن تمہارا ان اشغال سے واقف ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ کسی وقت یہ وہم نہ ہو کہ یہ بھی کوئی بڑی چیز ہے۔ اصل ذکر اور اصل شغل توحید ہے اور بس۔ یاد خدا سے بڑھ کر اور کوئی نہ ذکر ہے نہ شغل''۔ (علم تصوف، صفحہ ۱۲۵)

---

[1] عبداللہ خان خویشگی نے ''فرہنگ عامرہ'' میں خواجہ صاحب کا سال ولادت ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء بتایا ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور حفیظ ہوشیار پوری نے بھی سال ولادت ۱۸۸۳ء ہی بتایا ہے۔ لیکن خاندانی دستاویز سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

نوٹ: ۱۹۳۸ء میں انہوں نے پنشن لی، اگر چہ سرکاری کاغذات میں ۱۸۷۶ء سال پیدائش درج ہوتا تو اس دن ان کی عمر ۶۲ ہوتی۔ اس زمانے میں ۵۵ برس کی عمر میں ریٹائرمنٹ ہوتی تھی۔ اس لیے امکان ہے کہ سرکاری کاغذات میں ان کا سال پیدائش ۱۸۸۳ء ہو۔ اور اس کے مقابلے میں اصل پیدائش کا سال ۱۸۷۶ء ہو۔ مدیر

مذہبی تعلیم کے علاوہ بڑے ابا جی نے M.A.O (محمڈن اینگلو اورئنٹل) سکول امرتسر سے تعلیم حاصل کی۔ کالج کا میرے والد کو علم تھا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ابتدائی برسوں کے گریجویٹ تھے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق ان کو زمانہ طالب علمی سے ہی تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۰۶ء میں ان کی پہلی کتاب ''بغداد'' مطبوعہ نولکشور پرنٹرز امرتسر/لاہور نے شائع کی۔

ان کی بیشتر کتابیں میرے علم میں نہیں تھیں۔ ان کی تلاش میں میں نے کوئی مارکیٹ، اتوار بازار، اردو بازار لاہور، راولپنڈی اور جہلم کی نئی اور پرانی کتابوں کی کوئی دوکان نہیں چھوڑی۔ پنجاب پبلک لائبریری، قائداعظم لائبریری سے کچھ کتابوں کی فوٹو کاپی کروانے کی اجازت ملی (جس کے لیے پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب کی بہت ممنون ہوں) اس تمام بھاگ دوڑ میں میرے بیٹے خواجہ بلال شوکت نے میری مدد کی۔ میں تو عرق النساء (Sciatica) میں مبتلا تھی اور چلنے پھرنے کے قابل نہ تھی۔ تمام چکر بازاروں اور دوکانوں کے بلال بیٹے نے اپنے ذمہ لیے۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے متعلق معلوم ہوا کہ امرتسریوں کے متعلق جتنا وہ جانتے ہیں شاید ہی کوئی اور جانتا ہو۔ تلاش بسیار کے بعد ان کا فون نمبر ملا۔ ان سے بات ہوئی۔ کئی کتابیں ان کے پاس تھیں اور کئی کتابوں کے نام انہوں نے مجھے بتائے۔ ان کی جو تصنیفات و تالیفات اور تراجم اب تک دستیاب ہوئیں ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ بغداد۔ مطبوعہ نولکشور پرنٹرز، لاہور/امرتسر ۱۹۰۶ء
۲۔ دمشق۔ شیخ عبدالعزیز پرنٹرز، امرتسر ۱۹۱۱ء
۳۔ حضرت زیدؓ۔ شیخ عبدالعزیز پرنٹرز، امرتسر، ۱۹۱۱ء
۴۔ ترجمہ و شرح دیوان حافظ۔ تالیف ۱۹۱۲ء، طبع اول ۱۹۱۶ء
۵۔ صدیق اکبرؓ۔ تالیف ۱۹۱۹ء۔ طبع اول ۱۹۲۰ء
۶۔ سوکھی روٹی کا ٹکڑا۔ مولا بخش کشتہ۔ امرتسر، ۱۹۲۱ء
۷۔ علم تصوف۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۵۱ء
۸۔ خلافت اسلامیہ۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۵۱
۹۔ مذاہب اسلامیہ۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۵۲ء
۱۰۔ بیدل۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۲ء۔ ۱۹۶۱ء۔ ۱۹۸۸ء
۱۱۔ اسلام میں حریت، مساوات، اخوت ۱۹۵۵ء
۱۲۔ مشاہیر اسلام۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۵۸
۱۳۔ اسلام اور حقوق انسانی
۱۴۔ اصول اسلام
۱۵۔ عجمی مذاہب کا اثر مسلمانوں کے عقائد پر
۱۶۔ اصول فقہ اسلامی اور حدود اللہ و تعزیرات
۱۷۔ وحدت الوجود
۱۸۔ ابن العربی

۱۹۔ ترجمہ وشرح مثنوی مولانا رومؒ

۲۰۔ ترجمہ وشرح رباعیات ابوسعید ابوالخیر

اباجی لکھتے ہیں:۔

''تصوف میں اشعار سب سے پہلے سلطان ابوسعید ابوالخیر نے کہے۔ میں نے ان کی رباعیات کا اردو ترجمہ اور شرح لکھی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ ان ایام میں یہ منشی فاضل کے نصاب تعلیم میں داخل تھیں''۔

۲۱۔ تاریخ پاکستان۔ تاریخ وار۔ غیر مطبوعہ

۲۲۔ ''لمعات'' (شعری مجموعہ)۔ غیر مطبوعہ

۲۳۔ ڈائری (ذاتی یادداشتیں)۔ غیر مطبوعہ

۲۴۔ لسانیات

خواجہ صاحب کے علمی مقالات ''طلوع اسلام'' (کراچی)، ''البیان'' اور ''تجدید عہد'' (لاہور) میں شائع ہوتے رہے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ اخبارات ''زمیندار'' اور ''نوائے وقت'' میں ان کے مضامین اور کلام شائع ہوتا رہتا تھا۔ جن کے تراشے انہوں نے اپنی غیر مطبوعہ کتاب ''تاریخ پاکستان'' میں مختلف مقامات پر چسپاں کیے۔ اس کے علاوہ کچھ دوسرے غیر مطبوعہ مسودات بھی تھے جن کو جہلم کے سیلاب نے اتنا خستہ کر دیا ہے کہ ان کا پڑھنا ممکن نہیں رہا۔ سیلاب آیا تو میں لاہور تھی دریائے جہلم کی مہربانیاں اسی دوران میں ہوئیں۔ یہ دوسری لائبریری تھی جو اباجی (میرے دادا جان) اور بھائی جان (میرے والد) کی ضائع ہوئی۔ اس سے پہلے ان کی دینا نگر میں بہت بڑی لائبریری تھی۔ قیمتی اور نایاب کتب کا ذخیرہ تھا۔ تقسیم ہند کے وقت اس لائبریری کو وہاں چھوڑنے کا بڑا دکھ تھا۔ میرے والد نے ہجرت سے پیشتر تمام کتب دینا نگر کی واحد لائبریری ''سناتن دھرم لائبریری'' کو عطیہ میں دے دیں۔ اس طرح نایاب کتب گلیوں اور بازاروں میں بکنے اور صفحہ صفحہ بکھرنے سے بچ گئیں۔ ان کے لیے یہی بات باعث اطمینان تھی۔ علم وادب سے لگاؤ کے ساتھ ساتھ اباجی ملازمت بھی کرتے رہے۔ تقسیم ہند سے پہلے تحصیل دار رہے، ڈپٹی بھی رہے۔ جزائر انڈے مان میں چار سال افسر خزانہ رہے۔ یہ دور ۱۹۱۴۔۱۹۱۲ء کا تھا۔ رشوت اور سفارش ان کے لیے بہت مشکل کام تھا اس لیے ترقی نہ کر سکے۔ پھر کچھ عرصہ جہانیاں میں بطور سپرنٹنڈنٹ کام کیا۔ اس کے بعد مال افسر ہو کر بصرہ فوج میں چلے گئے۔ چند سال فوج میں رہے۔ واپسی پر رخصت لی اور ''صدیق اکبرؓ'' مکمل کی۔ غالباً ۱۹۲۹ء میں لاہور چھاؤنی میں ملٹری اسٹیٹ آفس میں بعہدہ E.A.C تقریباً ایک سال کام کیا۔ بسلسلہ ملازمت سرگودھا اور علی پور میں بھی رہے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف جگہوں پر تبادلے ہوتے رہے۔ ان آئے روز کے تبادلوں سے تنگ آ کر ۱۹۳۸ء میں پنشن لے لی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصہ میر پور میں آنریری سیشن جج بھی رہے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں اباجی کچھ مقدمات قتل کے سلسلے میں میر پور میں تھے۔ (بحوالہ ان کی ڈائری)

تقسیم ہند کا مطالبہ پوری شدت سے جاری تھا۔ ہندوستان افراتفری کی لپیٹ میں تھا۔ میں گورنمنٹ گرلز سکول گورداسپور میں پڑھتی تھی اور ہوسٹل میں رہتی تھی۔ اباجی مجھے لے کر جہلم آ گئے جہاں ان کی بڑی بیٹی (محمودہ اختر) میری پھوپھو مقیم تھیں۔ بھائی جان (میرے والد) ابھی دینا نگر ہی میں تھے جو بعد میں قافلے کے ساتھ بے سروسامانی کی حالت میں جہلم پہنچے۔ ان کے آنے کے بعد ہم نے جہلم نے مستقل رہائش اختیار کی۔

میرے دادا کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی کا نام بھی محمودہ اختر تھا جو بچپن ہی میں وفات پا گئیں۔ باقی تین اولادوں میں بڑی بیٹی محمودہ اختر (ان کا نام بھی محمودہ اختر ہی رکھا گیا) چھوٹی بیٹی سعادت اختر اور میرے والد کرامت اللہ قمر یہ وکیل تھے۔ شاعر بھی تھے۔ دینا نگر میں تو زمینداری کرتے تھے لیکن جہلم آ کر وکالت ہی کی۔ پچپن چھپن برس کی عمر میں (۱۲ دسمبر ۱۹۶۳ء) کو ان کا انتقال جہلم میں ہوا اور وہیں دفن ہیں۔

جہلم میں میرے دادا، والد اور میں۔ یہ ہمارا مختصر سا خاندان تھا۔ ایک مکان دادا کے نام اور کچھ زمینیں والد کے نام الاٹ ہوئیں۔ اس طرح وقت گزرتا رہا اور حالات بہتری اختیار کرتے گئے۔ میرے دادا کے علمی معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی پڑھنا وہی لکھنا وہی ادبی محفلیں اور وہی مشاعرے۔ وہ مسلسل لکھتے رہتے تھے۔ حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ اس ضعیفی میں اتنے دماغی کام کے باوجود کبھی ذہنی یا جسمانی تھکاوٹ کا اظہار نہیں کیا۔ ان کا بیشتر وقت قرآن کریم کے مطالعہ میں گزرتا۔ انہوں نے اسلام کو قرآن پاک کی روشنی اور احادیث صحیحہ کے مطابق پیش کیا۔

غلام نبی انصاری صاحب تجدید عہد کے صفحہ نمبر ۳ پر خواجہ صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:۔

''ایک بات جو سمجھنے کی ہے اور جسے خواجہ صاحب خاص طور پر واضح کر چکے ہیں یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد شخصی تفقہ میں کوئی شخص مکلف نہیں کہ تسلیم کرے۔ اس لیے جو کچھ خواجہ صاحب نے لکھا ہے شخصی تفقہ ہے اور کوئی مسلمان مکلف نہیں کہ تسلیم کرے۔ خواجہ صاحب دعوت فکر دیتے ہیں اور بس''۔

قرآن پاک کی تفسیر لکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ زندگی نے مہلت ہی نہ دی جس سال (فروری ۱۹۵۹ء) شادی کے بعد جہلم سے میری رخصتی ہوئی اسی سال ۳۰ دسمبر ۱۹۵۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

میرے بچپن کا زیادہ وقت اباجی (دادا جان) کے ساتھ ہی گزرا۔ وہ بچوں سے بہت پیار کرتے۔ میں خاندان میں پہلا بچہ تھی اس لیے میرے ساتھ انہیں زیادہ لگاؤ تھا۔ جب امرتسر میں تھے تو مجھے ساتھ لے جاتے تھے۔ میں ہر جگہ ان کی انگلی پکڑے ان کے ساتھ ہوتی۔ جہلم میں میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں مجھے گورنمنٹ کالج فار ویمن راولپنڈی میں داخل کرا دیا گیا۔ ہر اتوار کو جہلم آنا ہوتا تھا۔ کبھی ایسے نہ ہوا کہ اباجی مجھے لینے پہلے سے بس کے اڈے پر موجود نہ ہوں۔ بعض صورتوں میں ہفتے بھر کا انتظار ناقابل برداشت ہو جاتا تو درمیان ہی میں صبح پنڈی آتے اور مجھ سے مل کر شام کو واپس جہلم چلے جاتے تھے۔

دادا بڑے متحمل مزاج تھے۔ میں نے کبھی انہیں کسی کو ڈانٹتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ناراض ہونا تو شاید جانتے ہی نہ تھے۔ وہ بڑے متوکل اور سادہ مزاج تھے۔ اپنا کام خود کرتے اور ہمیں بھی یہی تلقین کیا کرتے۔ کھلتا ہوا بہت صاف رنگ، عالی دماغ شخصیت کا بھرپور تاثر لیے کشادہ پیشانی، بڑی بڑی گرے (Grey) رنگ کی ذہین آنکھیں اور بہت خوش پوش تھے۔ ہمیشہ صاف ستھرے رہتے۔ ہر قسم کا لباس زیب تن کرتے۔ شلوار اور قمیض کے علاوہ پینٹ (پتلون) اور اچکن زیادہ پہنتے تھے۔ جامہ زیب اتنے تھے کہ جو بھی پہنتے سجتا تھا۔ متناسب قد وقامت، دبلا پتلا جسم بہت سمارٹ تھے جس کا اندازہ ان کی تصاویر سے بھی ہوتا ہے۔ کسی زمانہ میں ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے، بعد میں جناح کیپ ہی پہنتے رہے۔

مصورانہ خطاطی۔اعزازات کی زبانی

اسلم کمال

خطاطی کا فن ایک عظیم اور قدیم فن ہے۔جس کی جڑیں ماضی میں بہت گہری ہیں۔یہ فن مسلم معاشروں کا بہت معزز فن شمار ہوتا آیا ہے جس میں مال و دولت اور سماجی رتبہ و حیثیت کے ہر امتیاز کے بغیر ہر کوئی مشق ہنر کر سکتا تھا یوں یہ ایک جمہوری فن تھا۔ایک شریف پیشہ تھا،نفیس ترین ذوق کا اظہار اور اظہار کا بلیغ ترین ذریعہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ آج اس کی تاریخ ارتقا اور عروج و زوال پر کتابیں لائبریریوں میں دستیاب ہیں۔جبکہ قیام پاکستان کے بعد اس سرزمین پر پیدا ہونے اور پروان چڑھنے والی ایک نوزائیدہ صنف فن مصورانہ خطاطی ۱۹۸۰ء تک کسی کتاب الاستناد سے محروم رہی۔اس سلسلے میں جو پہلا کام سامنے آیا وہ ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار ڈائریکٹر لاہور میوزیم کے قلم سے ظہور میں آیا۔آپ نے ایک جامع اور طویل مقالہ بعنوان Islamic Calligraphy بزبان انگریزی پشاور یونیورسٹی کے شعبہ آثار قدیمہ کی دعوت پر تحریر کیا اور اسی شعبہ کے زیر انتظام چار روز بین الاقوامی سیمینار بعنوان ''آثار قدیمہ۔تعمیر اور خطاطی'' بمقام ہوٹل انٹر کانٹینینٹل پشاور میں پڑھا۔ملکی اور غیر ملکی مندوبین اور سامعین نے اسے بہت سراہا اور اسے کتابی دینے کا مطالبہ کیا۔چنانچہ شعبہ آثار قدیمہ پشاور یونیورسٹی نے اسے کتابی شکل میں چھپوایا اور اس کتابچہ کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۲ء میں آ گیا۔خطاطی اور مصورانہ کی یہ وہ اولین تاریخ ہے جس میں پاکستان میں ظہور پذیر ہونے والے ٹیکنیکی تخلیقی اور اجتہادی اضافوں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔فن پاروں کے عکس بھی شامل کیے گئے ہیں۔اس حوالے سے مصورانہ خطاطی کے پہلے مورخ ہونے کا اعزاز ڈاکٹر ڈار کو جاتا ہے۔''نئے رجحانات'' کے عنوان کے تحت اس کتاب میں یوں بیان ہوا ہے۔

پاکستان میں اس رجحان (مصورانہ خطاطی) کے بانی شاکر علی ہیں۔حسن اتفاق سے جو اس ملک میں جدید مصوری کے باب کہلاتے ہیں۔انہوں نے اگرچہ تھوڑا کام کیا لیکن راستہ دکھا گئے۔شاکر علی کے بعد حنیف رامے نے بیڑا اٹھایا۔تاہم یہ دونوں بانی دادِ حق جاری نہ رکھ سکے۔یہ کام صادقین اور اسلم کمال نے کیا۔انہوں نے باقاعدہ دو تحریکوں کی صورت میں اس رجحان کو آگے بڑھایا اور یہ امر واقعہ ہے کہ یہ دونوں ہی اصل اس میدان کے رہنما ہیں۔صادقین اپنے فن اور اپنے انداز کے مشہور مصور ہیں۔انہوں نے مصورانہ خطاطی کی تحریک میں روح پھونک دی اور عوام الناس کے علاوہ افسر شاہی میں بھی اسے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔انہوں نے ملک اور ملک کے باہر متعدد نمائشیں کیں۔صادقین نے اپنا اسلوب خطاطی حروف کے پھیلاؤ سے حاصل کیا۔انہوں نے حروف کی عمودی قامت میں غیر معمولی اضافہ کیا۔جس سے ان کے اسلوب میں خطِ طغرہ میں تصرف یا اس خط کی آزاد تعبیر کا تاثر پایا جاتا ہے۔

صادقین کے بعد اس ملک میں مصورانہ خطاطی کے فن کاروں میں سب سے زیادہ مشہور اور مقبول بلاشبہ اسلم کمال ہیں۔ان کا اسلوب بالکل جداگانہ اور منفرد ہے۔مثلث ان کے اسلوب کی اکائی ہے جس پر مثلث،کوفی اور نسخ کے اشتراک و امتزاج سے وہ حروف ابجد کی تشکیل نو کرتے ہیں۔وہ روایتی خطاطی کی پانچ یا چھ بنیادی افقی کرسی کی لکیروں کو مسترد کر کے صرف تین بنیادی افقی لائنوں میں داد ہنر دیتے ہیں۔انہوں نے خطِ کوفی نسخ اور ثلث کے تاریخی کردار کی جانب رجوع کر کے پس منظر میں اسلامی تعمیراتی مونقس کے الحاق سے اعلیٰ فنکارانہ انداز اور خوبصورت رنگوں میں بلاشبہ اسلامی آرٹ اور فن تعمیر کی روایت کی تعبیر نو کرنے کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔

''مرقع خط'' کے نام سے خطاطی اور مصوری خطاطی کی دوسری تاریخ ہے۔جو لاہور میوزیم کے ریسرچ آفیسر طارق مسعود کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔یہ جون ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔مرقع خط کا پیش لفظ جناب بی اے قریشی چیئرمین لاہور عجائب گھر نے لکھا ہے۔مرقع خط کے مطابق وفاقی حکومت نے پندرھویں صدی ہجری کے استقبال کی تقریبات کے سلسلے میں اسلامی خطاطی کی کل پاکستان نمائش کی ذمہ داری لاہور عجائب گھر کو سونپی اور لاہور عجائب گھر نے یہ ذمہ داری نبھائی۔اس نمائش میں ۱۰۲ خطاطوں اور مصوروں نے ۲۵۰ فن پارے برائے نمائش جمع کرائے۔اس نمائش کو بعد میں اسلام آباد منتقل کیا گیا۔اس کتاب میں خطاطی اور مصورانہ خطاطی کے اعلیٰ فن پاروں کے رنگین اور بلیک اینڈ وائٹ عکس بھی شامل کیے گئے ہیں۔فنکاروں کے مختصر کوائف اور فن پاروں کی تعداد بھی بتائی گئی ہے۔نمائش کا افتتاح وفاقی وزیر ثقافت میجر جنرل (ر) شاہد حامد نے کیا اور خطبہ صدارت میں اس نمائش کو سراہتے ہوئے کہا۔''لاہور عجائب گھر کی اس نمائش میں جناب حافظ محمد یوسف سدیدی،صادقین،سید انور حسین نفیس رقم اور اسلم کمال کے شہ پارے ایک ہی مقصد حیات کا اظہار کرنے کے لیے ایک دوسرے کے شانہ بشانہ موجود ہیں''۔

مرقع فن میں مصورانہ خطاطی کے جن مصوروں کو بانیوں میں شمار کیا گیا ہے اور ان کے فن پر مختصر آرا بھی دی گئی ہے ان کے اسماء علی الترتیب یہ ہیں۔شاکر علی،حنیف رامے،آذر زوبی،گل جی،صادقین،رشید احمد ارشد اور اسلم کمال۔جن مصور خطاطوں کے اسماء شمار کیے گئے وہ اس ترتیب سے ہیں۔سردار احمد،این واسق،انور انصاری،عبدالواحد ناصا تعلم،ظہور ناظم،شفیق فاروقی، سرور راہی،آفتاب احمد،رشید بٹ،ابن کلیم،غلام فرید بھٹی اور اے جی ثاقب۔

رائل سوسائٹی آف آرٹسٹس اردن کی صدر شہزادی وجدان کی آمد پر اس کو لاہور عجائب گھر نے اسلم کمال کی ایک مصورانہ خطاطی کا فن پارہ تحفہ میں پیش کیا۔

۱۹۸۱ء میں پاکستان پبلک ریلیشن سوسائٹی نے وفاقی حکومت کی پندرھویں صدی ہجری کے استقبال کی تقریبات کے سلسلے میں اپنی بے لوث خدمات اسلامی خطاطی و مصورانہ خطاطی کے فروغ کے لیے وقف کر دیں۔سیکرٹری جنرل جناب نزاکت علی بھٹی نے کل پاکستان مقابلے کروائے۔مصوروں اور خطاطوں کے کوائف اور ان کے فن پاروں کے عکس پر مشتمل تعارفی لٹریچر شائع کیا۔ذرائع ابلاغ کا تعاون حاصل کر کے فن کاروں کے انٹرویو کروائے۔لاہور اسلام آباد اور پشاور میں بڑے پیمانے پر نمائشیں کروائیں۔

۱۹۸۱ء پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس نے اسلام آباد میں مصورانہ خطاطی کے گروپ شو کروانے کا انتظام کیا اور ۱۹۸۱ء میں عالمی ادارہ یونیسف نے ہجری صدی کے آغاز پر رشید بٹ اور جمیل قریشی کی روایتی خطاطی اور اسلم کمال کی مصورانہ خطاطی کے فن پاروں کے تہنیتی کارڈز دنیا کی گیارہ زبانوں میں شائع کیے۔لاہور عجائب گھر نے جرمن مستشرق پروفیسر ڈاکٹر انماری شمل کو اسلم کمال کی مصورانہ خطاطی کا فن پارہ تحفہ میں پیش کیا۔

چین کے ساتھ ثقافتی معاہدوں کی تجدید کے لیے وزیر ثقافت و سیاحت ارباب محمد نیاز کی قیادت میں ایک اعلیٰ سطح کے سرکاری وفد میں آنا ناصر فلم اور فنون ادائیہ کے نمائندے کی حیثیت سے اور اسلم بصری فنون کے نمائندہ کے طور پر شامل ہوئے۔ اسلم کمال نے بیجنگ،شنگھائی،سوچو،ہانگچر اور کینٹن کی آرٹ کونسلوں میں مصورانہ خطاطی پر لیکچر دیے۔عملی مظاہرے کیے۔الحمراء

آرٹ کونسل کی ڈپٹی ڈائریکٹر مسز تانیہ بٹ نے چینی مصوری کی ایک ذہین طالبہ کے طور پر یہ لیکچر سنے اور عملی مظاہرے بھی دیکھے۔ وزیر ثقافت پاکستان نے ان کی مصورانہ خطاطی کا ایک فن پارہ حکومت چین کو گریٹ ہال بیجنگ کے لیے پیش کیا۔

صادقین نے ہندوستان میں مصورانہ خطاطی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ انہوں نے وہاں پر اپنے قیام کے دوران دہلی اور دوسرے شہروں میں اعلیٰ مقامات پر اپنے فن کے لازوال نقوش ثبت کیے۔ اور وہاں پر صادقین کا بہت پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ گل جی نے اسلام آباد فیصل مسجد کی محراب میں کھلے ہوئے قرآن پاک کی شکل کے ایک سکیچر پر روایتی خط کوفی کا جادو جگایا۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے قومی نشریاتی رابطہ پر پروگرام ''تہذیب وفن'' کے سلسلے میں اسلم کمال نے پچاس منٹ دورانیے کا مصورانہ خطاطی پر لیکچر دیا۔ اور ٹیلی ویژن اکیڈمی اسلام آباد میں ''اسلامی خطاطی۔ مصورانہ خطاطی تک'' کے عنوان سے لیکچر اور ساتھ عملی مظاہرہ کیا۔ اخبارات ورسائل میں مصورانہ خطاطی پر تعارفی مضامین لکھے۔

پاکستان کے طول وعرض میں اب نئے ابھرنے والے مصور خطاطوں نے اپنے اپنے اضلاع میں اپنے انفرادی شوکرنے شروع کر دیئے۔ جو مصور خطاط تیزی سے ابھر کر سامنے آئے ان کے اسماء یہ ہیں۔ سردار احمد، ظہور ناظم، عبدالرشید خان، عبدالفتح سید، شفیق فاروقی اور محمود الحسن جعفری نے اپنی کئی انفرادی نمائشیں کیں۔ اور انعامات واعزازات حاصل کیے۔

صادقین نے لاہور، اسلام آباد، پشاور اور کوئٹہ میں کئی اہم مقامات پر رنگین مارکروں کے مصورانہ خطاطی کے شاہکار تخلیق کیے۔ صدر پاکستان نے انڈونیشیا اور ملائشیا کے دورے پر اسلم کمال کے پانچ مصورانہ خطاطی کے فن پارے ان ممالک کو پاکستان کے قومی تحفے کے طور پر پیش کیے۔

پاکستان کے بین الاقوامی شہرت کے مالک فوٹوگرافر، خطاط، مصور اور پولیس آفیسر آفتاب احمد نے اسلامی کیلی گرافی (ن والقلم) کے نام سے ایک اعلیٰ پائے کی ایسی آرٹ بک شائع کی جو اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں خطاطی کی مستند تاریخ ارتقا اور عروج بہت ہی دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مختلف رسم الخطوں کی ایجاد ان کے حسن وجمال اور فنی محاسن کو جس طرح اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے اور ڈایا گرامز کے ذریعے ان کی تشریح کی اور تفہیم کو آسان بنایا گیا ہے۔ اس نے اس کتاب میں مصورانہ خطاطی کے صرف وفن کاروں کو صاحب اسلوب مصور اور خطاط قرار دیا ہے۔ ان دونوں کے طرز خطاطی کو باقاعدہ رسم الخط تسلیم کیا ہے۔ صفحہ ۱۷۴ پر اسلم کمال کے خطِ کمال اور صفحہ ۱۸۲ پر صادقین کے ''خطِ صادقین'' میں سورہ فاتحہ کے عکس شامل کیے گئے ہیں۔

مئی ۱۹۸۶ء میں پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس نے کثیر سرمائے سے ''تاریخی خطاطی'' شائع کی۔ اسے اعجاز راہی نے لکھا ہے۔ یہ کتاب سوا دو سو صفحات کی ہے۔ دو سو نو صفحات خطاطی کی تاریخ اور اس کے دبستانوں کے بارے میں بحثوں پر مشتمل ہیں اور اس میں صرف پندرہ صفحات مصورانہ خطاطی کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں فن پاروں کے بلیک اینڈ وائٹ اور رنگین عکس وافر مقدار میں شامل کیے گئے۔ اعجاز راہی ''تاریخ خطاطی'' میں لکھتے ہیں۔

حنیف رامے نے ابجد کو بڑی اہمیت دی ہے۔ وہ رنگ کے استعمال کو بھی حرف کی شناخت کا ذریعہ بناتے ہیں۔ شاکر علی روایت اور جدت کے سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ روایت کے اعتبار سے قومی موضوعات، زمین کی خوشبو، معاشرتی رویست ان کے ہاں ملتے ہیں تو جدت کے اعتبار جدید یورپی ٹیکنیک کا شعور ان کی پہچان ہے۔ صادقین نے نہ صرف حرف کی ساخت تبدیل کی بلکہ خطاطی بطور ''کل'' پیش کیا۔ صادقین کے فن میں رنگ اور حرف کے نئے رشتوں نے ایک نئی طرز صادقین کو نمایاں کیا ہے جس کا خوبصورت پس منظر ان رنگوں سے تشکیل پاتا ہے جو آیات ربانی کی تفسیر کرتے ہوئے کلام اللہ کے معنوی تناظر میں جدید حسیت کی ایک سطح خلق کرتے ہیں۔ اسلم کمال کا فن قدیم وجدید کا سنگھم ہے۔ جہاں مصوری اور خطاطی، رنگ اور حرف، روایتی تقدس اور جدید عصری شعور آپس میں گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے برسوں سرورقوں پر حرفوں کی تخلیق کرتے ہوئے ان کی ایک ایک قوس ایک ایک زاویے پر نظر رکھی ہے تب وہ ابجد کو RESHAPE کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

آذر زوبی ایک مصور، سنگ تراش اور خطاط ہونے کے ناطے سے جدید طرز احساس اور قدیم دروپست میں پوری طرح شریک ہیں۔ جس کے سبب ان کا قلم ہر زاویے ہر خط ہر قوس سے تخلیق کار کے فن کا اظہار کرتا ہے۔ حرف ورنگ کی ایک دلپذیر اور منفرد سطح ابھارنے والا فنکار سردار احمد پاکستان کے ان نامور خطاطوں میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے رنگ اور حرف پر اعتبار قائم کیا۔ آفتاب احمد حرف کی حرمت سے واقف ہیں۔ وہ فن خطاطی کی دنیا میں شوقیہ یا شہرت کے لیے داخل نہیں ہوئے۔ بلکہ مصوری اور خطاطی ان کے مقصد حیات کا حصہ ہیں۔ شفیق فاروقی نوجوان مصوروں کے اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جو مصوری کو شہرت کا سامان کرنے کی بجائے اسے مقصد حیات کے ایک جزو اور پرتو کے طور پر لیتے ہیں۔ ذوالفقار احمد تابش کا فن توازن اور تناسب کے ایک انوکھے پن کے ساتھ الوہیت کے جذبے سے سرشار ان کی پہچان کا ایک الگ منطقہ قائم کرتا ہے۔ غلام فرید بھٹی کا مقام ہمارے ملک کے صاف ستھرے خطاطوں میں ہوتا ہے۔ این واسق، انور انصاری، عبدالواحد، نادر القلم، ظہور ناظم، سرور راہی، اے جی ثاقب، ابوالفتح، خدا بخش ابرو، محمد جمیل حسن، رانا مصطفیٰ، ایم اے لطیف محمد طارق، نثار احمد، نجم الثاقب اور نسیم شہزاد کے علاوہ ایک طویل فہرست ان نوجوانوں کی بنتی ہے جو عصر حاضر میں فن خطاطی کی دنیائیں روشن کر رہے ہیں۔

اعجاز راہی سعدیہ اعجاز کے بارے میں لکھتے ہیں ''سعدیہ اعجاز نے فن مصوری کے حوالے سے قرآن پاک کی عظمت کو دیکھا اور خطاطی کا سہارا لے کر ان عظمتوں کو پھیلانے کا ارادہ کیا۔ اب مصورانہ خطاطی میں الگ شناخت کی حامل بنتی جا رہی ہیں''۔

''تاریخ خطاطی'' کے بارے میں یہ ایک مقام حیرت ہے کہ کچھ ایسے مصور اور خطاط حضرات کا تذکرہ اس میں کہیں نظر نہیں آتا جو اگرچہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے نصف دوم میں ابھر کر سامنے آئے لیکن اس مختصر عرصے میں انہوں نے اتنے بھرپور فن کا مظاہرہ کیا کہ ان کے بغیر تاریخ خطاطی مکمل نہیں ہو سکتی ان میں اول نمبر پر ملتان کے شاعر، مصور، خطاط، ظروف ساز، نقاد اور ڈیزائنر زوار حسین جیسا کثیر الجہات شخص کہیں کہیں پیدا ہوتا ہے۔ شبنم انور دل امریکہ میں ایک یونیورسٹی میں لسانیات کے پروفیسر ہیں اور خطاطی میں بھی کمال کرتے ہیں۔ عسکری یہاں ایرانی نیشنل کالج آف آرٹس لاہور میں استاد تھے اور اعلیٰ مصور اور خطاط ہیں۔ بشیر جو ہر بہت اچھے سرورق ساز اور بہت عمدہ مصور اور خطاط ہیں۔ ظلم حما بہت عمدہ ڈیزائنر اور خطاط ہیں۔ رفعت جبیں بابری بہت دبین اور مصورانہ شعور کی مالک خطاط ہیں۔ محمد ارشد کمال جدہ میں مقیم پاکستانی خطاط اور مصور تھے۔ جدہ میں ہی نور محمد جرال بہت عمدہ خطاط ہیں۔ ان کے علاوہ محمود الحسن جعفری، سلیم اللہ صدیقی، سید ممتاز، ظہور کاظمی، مقبول احمد، ایوب شہزاد، یسی یونس، بلال جاوید، جمشید خان، خادم حسین کشش، محمد افضل، عارف قریشی، محمد یوسف، اسلم کاشر، ناصر حق اور عماد صمدانی اور محمد سعید بودلہ بے حد خوبیوں کے مالک مصور اور خطاط ہیں۔

صادقین نے ابوظہبی اور دوبئی میں مختلف مقامات پر اپنے فن کے کمالات دکھائے اور دوبئی میں ایک سرکاری عمارت میں مصورانہ خطاطی کا عمدہ میورل پینٹ کیا۔

مصورانہ خطاطی دن بہ دن جدید یورپی مصوری کی تیکنیکی خوبیوں اور تصویری محاسن سے مالا مال ہو رہی ہے۔ اپنی ماہیت

میں اسلامی شعور سے روشن اور جمالیات کے عصری تقاضوں سے اپنے خارج میں آہنگ ہے۔ ۱۹۸۶ء کے نصف آخر میں اسلم کمال نے متعدد یورپی ممالک میں ۶ ماہ کے عرصے میں بیس نمائشیں کر کے اس مصورانہ خطاطی کو عالمی ثقافتی منظرنامے میں شامل کر دیا۔ ناروے کے مختلف شہروں کے فنون لطیفہ کے اداروں میں اس فن پر لیکچر دیئے اور عملی مظاہروں سے اس کے حسن و جمال کی تشریح کی۔ سویڈن، جرمنی، ڈنمارک اور لندن میں مصورانہ خطاطی کی کئی نمائشیں کیں اور اس اسلامی فن کو جگہ جگہ متعارف کروایا۔

۱۹۸۷ء کو سیالکوٹ میں بھی ان کی مصورانہ خطاطی کی نمائش کا افتتاح صدر پاکستان نے کیا۔ مصورانہ خطاطی کی یہ پہلی نمائش تھی جس کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔

صادقین کو اٹلی کی ایک تنظیم نے بیش قیمت ''مرکری ایوارڈ'' عطا کیا۔ یہ مرکری ایوارڈ صدر پاکستان غلام اسحاق خان کو بھی اسی سال ملا۔

۱۹۸۷ء میں مصورانہ خطاطی کو اپنی تاریخ کے سب سے بڑے سانحے سے دوچار ہونا پڑا۔ پاکستان کی مصوری اور خطاطی کا عالمی شہرت یافتہ نابغہ عصر صادقین اس جہان فانی میں اپنے فن کے لافانی نقوش چھوڑ کر اپنے پیچھے کبھی نہ ختم ہونے والا خلا چھوڑ گیا۔

۱۹۸۷ء میں الحمراء آرٹس کونسل لاہور میں حنیف رامے نے امریکہ سے واپسی اور پورے چوبیس برس مصوری اور خطاطی سے کنارہ کشی کے بعد ایک لیکچر دیا جس میں اس نے شاکر علی صادقین اور اسلم کمال سب کو مسترد کرتے ہوئے صرف اور صرف اپنا اثبات کیا۔ دوسرے دن روزنامہ مشرق میں انتظار حسین نے اپنے کالم میں لکھا'' حنیف رامے کو یہ یاد رہا کہ شاکر علی اور صادقین مر چکے ہیں لیکن وہ یہ بھول گئے کہ اسلم کمال ابھی زندہ ہے''۔

دفتر خارجہ پاکستان نے دنیا بھر میں اپنے سفارت خانوں کو ایک پاکستانی ٹچ دینے کے لیے مختلف مصوروں اور خطاطوں سے خطاطی اور مصورانہ خطاطی کے فن پارے خریدے۔ اسلم کمال سے بھی ڈھائی سو فن پارے حاصل کیے گئے۔

۱۹۸۸ء میں الحمراء آرٹس کونسل لاہور مصورانہ خطاطی کا ایک بہت عمدہ گروپ شو خانہ فرہنگ ایران کے تعاون سے ہوا۔ جس میں ظہور کاظمی، صبیحہ اعجاز، محمد یوسف، شفیق فاروقی، محمد ذاکر، سلیم کاشر، محمد حنیف رامے اور اسلم کمال نے بھی حصہ لیا۔

۱۹۸۸ء میں پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس نے یونیسکو کے اشتراک سے "PAINTINGS FROM PAKISTAN" کے نام سے پاکستان کے آرٹ پر پہلی مکمل کتاب شائع کی۔ یہ حقیقی معنوں میں ''آرٹ بک'' کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس کا سائز 12 ½ x 9 ½ ہے۔ اور اعلیٰ ترین آرٹ پیپر کے 124 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ حاجی محمد شریف سے جمیل نقش تک پاکستانی مصوری کے ۱۳ رجحان ساز مصوروں کے مختصر تعارف اور ان کے فن پر مستند مضمون اور آرا کے ساتھ ان کے فن کے رنگین نمونے شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے ڈائریکٹر جنرل، سیکرٹری وزارت ثقافت، سیکرٹری تعلیم اور یونیسکو کے اعلیٰ عہدیداران کی آرا اور پیغامات بھی دیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں مصورانہ خطاطی کو پاکستانی مصوری کے ایک نمایاں ترین رجحان کے طور پر جگہ دی گئی ہے۔ اور مصور خطاطوں کی شمولیت کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے۔ صادقین، اسلم کمال، حنیف رامے، شاکر علی اور گل جی۔

اس آرٹ بک کے بارے میں ایک دلچسپ لیکن افسوس ناک صورت سامنے یہ آئی کہ ۱۹۸۸ء میں چھپنے والی یہ کتاب لگ بھگ ۸ برس تک کسی گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی۔ خیال اغلب یہ ہے کہ بزعم خویش ایک بڑا مصور جس کو اقتدار تک رسائی تھی اس کتاب میں اپنا ذکر نہ پا کر اس کو ردی کے ڈھیروں میں دبائے رکھا تھا۔ محترمہ کشور ناہید نے یہ کارنامہ کیا کہ اس نے اس کو سورج کی روشنی دکھائی، اس کو برائے فروخت سٹالوں پر رکھا اور اعلیٰ معیار کی اس واحد کتاب مصوری کو اہل نظر تک پہنچایا۔

۱۹۸۹ء میں اسلم کمال نے حکومت قطر کی وزارت اطلاعات اور شعبہ فنون لطیفہ کی دعوت پر قطر کے دارالحکومت دوحہ کے شیرے ٹن ہوٹل میں مصورانہ خطاطی کی نمائش کی۔

شاکر علی میوزیم لاہور میں مصورانہ خطاطی کی نمائش میں حنیف رامے، عبدالواحد نادر القلم، ظہور کاظمی، محمد یوسف، سرور راہی، اسلم کاشر، صبیحہ اعجاز اور سعید بودلہ کے علاوہ کئی نو آموز مصور خطاطوں نے حصہ لیا۔ پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس نے ہر سال ماہ رمضان میں خطاطی اور مصورانہ خطاطی کی نمائش کی روایت جاری رکھی۔

۱۹۸۹ء قائداعظم لائبریری باغ جناح لاہور نے اسلم کمال کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کیا اور ان کے فن پر ایک سلائیڈ شو بھی شامل تھا۔ اسلم کمال نے مصورانہ خطاطی اور اس کی ماضی میں جڑوں اور مستقبل میں امکانات پر ایک طویل لیکچر بھی دیا۔

۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۱ء

(چیدہ چیدہ واقعات)

۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک ان دو دہائیوں میں مصورانہ خطاطی نے اپنا ارتقائی سفر طے کیا، اس سفر کے اہم موڑ سر کیے۔ اہم واقعات و حالات میں سے گزرتی ہوئی، نت نئے تخلیقی ٹیکنیکی امکانات سے مالا مال ہوتی ہوئی اب اپنے مستقبل کی طرف رواں دواں ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۰ء پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس اسلام آباد کے زیر اہتمام بصری فنون کی ایک بین الاقوامی نمائش ہوئی۔ یہ نمائش الحمرا آرٹس کونسل میں منعقد ہوئی جس میں مصوری کے ساتھ مصورانہ خطاطی کا ایک باقاعدہ سیکشن قائم کیا گیا۔ اس کے بھی فن پارے غیر ملکی خطاطوں اور مصوروں سے منگوائے گئے یوں پاکستان میں مصورانہ خطاطی نے ایک اور کامیابی حاصل کر لی۔

عرب امارات کلچرل فاؤنڈیشن ابوظہبی میں اسلم کمال کی مصورانہ خطاطی کی نمائش ہوئی۔ مصورانہ خطاطی پر ایک لیکچر اور اس کے عملی مظاہرے کا بھی اہتمام کیا گیا۔ یہی نمائش ابوظہبی کے بعد دوبئی میں ہوٹل شیرے ٹن میں ہوئی۔ عربی اور انگریزی اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔

نیشنل کالج آف آرٹس لاہور کے استاد اور مشہور مصور احمد خاں نے مصورانہ خطاطی کو موضوع فن بنانا شروع کیا۔

حنیف رامے جو اس وقت پیپلز پارٹی کے قومی اسمبلی کے سپیکر تھے ان کی مصورانہ خطاطی کی نمائش پہلے نیرنگ گیلری میں اور بعد میں الحمرا آرٹس کونسل میں ہوئی۔ آرٹس کونسل کی وسیع و عریض گیلری میں رامے صاحب کی زندگی بھر کا کام ڈسپلے کیا گیا۔ ذرائع ابلاغ نے اس کو خوب کوریج دی۔ اس نمائش کا افتتاح صدر مملکت نے کیا اور مصورانہ خطاطی کی یہ دوسری نمائش تھی جسے یہ اعزاز ملا۔ اس نمائش میں رامے نے اخبار نویسوں کے سوال کے جواب میں کہا'' میری خطاطی صادقین اور اسلم کمال سے مختلف ہے'' اور انور سجاد نے کہا'' حنیف رامے نے صادقین اور اسلم کمال کی طرح اپنا علیحدہ اسلوب خطاطی پیدا نہیں کیا''۔

مصور اور خطاط سردار احمد کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ اپنے انداز کے بہت انتھک مقرر تھے۔ ۱۹۸۰ء کی قومی نمائش بصری فنون میں آپ کو مصورانہ خطاطی کا دوم انعام ملا۔

۱۹۹۴ء میں حکومت پاکستان نے اسلم کمال کو مصورانہ خطاطی کا صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی "PRIDE OF PERFORMANCE" عطا کیا۔ پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس نے اسلم کمال کی مصورانہ خطاطی، مصوری، کلام اقبال کی مصوری، کلام فیض اور فیض کی مصوری پر مشتمل آرٹ فولیو شائع کیا۔ اور نیشنل گیلری اسلام آباد میں اس کی مصورانہ خطاطی کی نمائش کا اہتمام کیا۔

پاکستان کی گولڈن جوبلی تقریبات کے سلسلے میں اردو سائنس بورڈ نے اسی مصور کی کتاب پاکستان کیلی گرافک آرٹسٹس گلڈ وجود میں آئی۔ گلڈ نے الحمرا آرٹس کونسل لاہور نے کتاب ''اسلامی خطاطی۔ ایک تعارف'' کی تقریب رونمائی کی۔ مشہور کارٹونسٹ میکسم (پروفیسر شوکت محمود) نے اظہار خیال کیا۔ پروفیسر عطیہ سید صدر شعبہ فلسفہ لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی نے مقالہ پڑھا اور وفاقی وزیر اسحاق ڈار نے صدارت کی۔ کچھ عرصہ بعد گلڈ نے اسلم کمال کی مصورانہ خطاطی کی نمائش الحمرا آرٹس کونسل میں کی۔ گورنر پنجاب نے افتتاح کیا اور گلڈ کے لیے ہر ممکن مالی مدد کا وعدہ فرمایا۔

مشہور مصور جمیل نقش نے مصورانہ خطاطی کے کئی کینوس پینٹ کر کے اس میدان میں اپنی آمد کا ایک خوبصورت اظہار کیا۔ اسلام آباد میں شاہراہ آئین پر سپریم کورٹ کے ساتھ وزیر اعظم سیکرٹریٹ کی زیر تعمیر عمارت کی لمبی لمبی دیواروں پر گنبدوں برجوں اور برجیوں کی کثرت دیکھ کر اسلام آباد کے اخباروں نے لکھا کہ وزیر اعظم سیکرٹریٹ کی زیر تعمیر عمارت کی صورت میں جیسے اسلم کمال کی مصورانہ خطاطی کا کوئی فن پارہ فن تعمیر میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کی عمارت میں اسلم کمال نے مصورانہ خطاطی اور مصوری کا مشترکہ میورل 10x22 فٹ سائز میں پینٹ کیا۔

پاکستان میں بیسویں صدی کی آخری نمائش مصورانہ خطاطی کی تھی جو ۱۱ ستمبر ۱۹۹۹ء کو الحمرا آرٹس کونسل لاہور میں ہوئی۔ صدر مملکت نے افتتاح کیا۔ یہ راقم الحروف کے فن پاروں پر مشتمل انفرادی نمائش تھی۔ اور ۲ دسمبر ۲۰۰۰ء کو ایوان اقبال لاہور میں صدر پاکستان نے اس کے فن کے اعتراف میں قائم ہونے والی مستقل گیلری کا افتتاح کیا۔ یہ مستقل گیلری کلام اقبال کی مصورانہ خطاطی اور مصوری پر مشتمل ہے۔

۲۰۰۱ء میں پاکستان کیلی گرافک آرٹسٹس گلڈ نے خطاطی اور مصورانہ خطاطی کی پہلی بین الاقوامی نمائش کے دعوتی کارڈ پر اسلم کمال کا فن پارہ شائع کیا۔ اس نمائش کا افتتاح صدر مملکت نے کیا۔ اور تین لاکھ روپے کی مالی مدد گلڈ کو دی۔ الحمدللہ پاکستان کی تہذیبی ثقافتی فکری اور روحانی روایات کی تعبیر نو مصورانہ خطاطی کے نام سے اس سرزمین کے بصری فنون کی قیادت کرتی ہوئی اکیسویں صدی میں قدم انداز ہوتی ہے۔

اسلامی کلاسیکی خطاطی و عمل موجد

پروفیسر غلام رسول تنویر

وہ دائرہ Circle جس میں موجد کے فن نے مختلف صورتوں میں سفر کیا۔ دراصل وہی تھا جس پر تمام اسلامی فنون کی بنیاد رکھی گئی تھی اور اسی میں اسلامی فنون نے ابتدا تا انتہا ارتقائی سفر طے کیا تھا اور یہی اسلامی فنون کی تشکیلی پہچان اور روحانی علامت کہلایا تھا۔ اسی دائرے سے مسلمانوں کے فن تعمیر نے جنم لیا اور اسی دائرے سے شعری اوزان اور میزان اور اسی میزان سے سرتال کے کلاسیکی صوتیات کا نظام ابھرا۔ موجد اور اسلامی فنون لطیفہ کی معنوی پیدائش ایک ہی معنوی دائرے کی محتاج ہے۔

موجد کا آرائشی Ornamentation عمل گو زیادہ متنوع نہیں لیکن اس کی باریکیوں میں اترنے اور اس سے قریبی لطف اندوز ہونے کے لیے یہ لازم ہے کہ ہم مذکورہ دائرے کی حدود کے تتبع میں رونما ہونے والے باریک بیل بوٹوں کے عمل کا ہلکا سا ادراک حاصل کریں۔ گو ان بیل بوٹوں کو یہاں دائرے کے اندر پورے عمل کے اظہار کی گنجائش نہیں تھی لیکن سردست ہمارا مرکز نگاہ دائرہ ہے اور دائرہ اپنی لامحدودیت سمیت سامنے موجود ہے۔

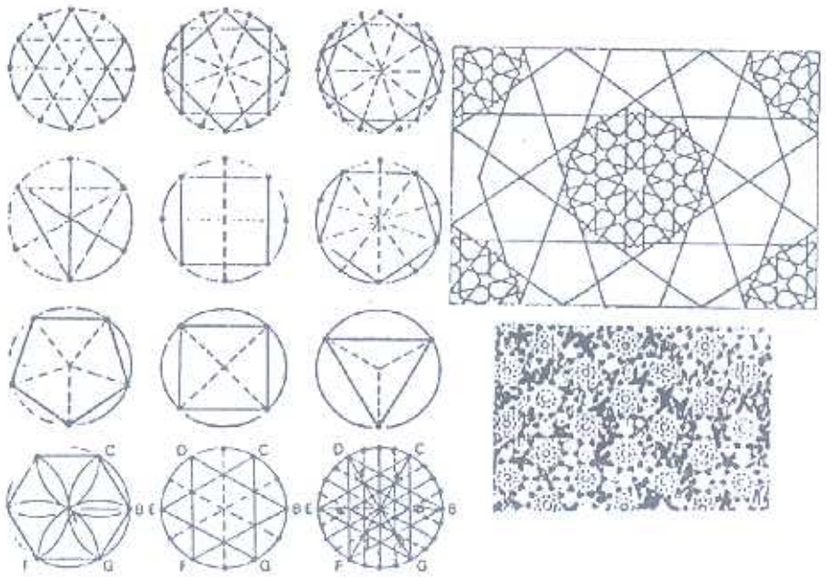

زیر نظر دائرے کی حدود میں نمودار ہونے والی سادہ سی تکون یا مربع سے ابھرتی رنگا رنگ کثیر الجہات اشکال Polygon سے اندازہ لگائیں کہ دائرے کی اس حدود میں کتنی وسیع الجہات لامحدودیت پوشیدہ ہے اور یہ بھی دیکھیے کہ اس

سارے عمل کی مستقل بنیاد یہ ہے کہ نئی شکل دائرے کو مساوی حصوں میں تقسیم کیے جانے سے جنم لیتی ہے اور مساویانہ تقسیم در تقسیم کا باہمی ربط ایک باہمی آہنگ در آہنگ کا موجب بنتے ہوئے تخلیق کا ایک وسیع عمل اختیار کرتا ہے اور اس سارے عمل کا حسن اعلیٰ یہ ہے کہ یہ نمو پذیر لامحدود کثرت اجزا اپنے لامحدود تسلسل میں اپنے کل اپنی احدیت سے اپنا ربط اور آہنگ کبھی ختم نہیں کرتی اور یوں مسلمانوں کا یہ جمالیاتی عمل مصوری تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کے روحانی عمل کا بھی حصہ بن جاتا ہے جس کی بنیاد وحدت یا توحید ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے مشرق و مغرب کے محققین نے برملا تسلیم کیا ہے۔ صرف ایک مستند مثال درج ہے:

"In the Islamic perspective, this method of deriving all the vital proportions of a building from the harmonious division of a cercle is no more than a symbolic way of expressing "Tawhid", which is the metaphysical doctrine of Divine Unity as the source and culmination of all diviersity."

(TITUS BURCKHARDT FEZ foreword to Islamic Art.)

دائرے کی احدیت میں پرویا ہوا مساویانہ تقسیم در تقسیم کا یہ لا متناہی عمل صرف اسلامی آرائشی مصوری Arabesque تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ منظم بکھراؤ اور مترنم بہاؤ، اوزان میزان کے ساتھ کلاسیکی شاعری کی بحر، قافیہ، ردیف کا حصہ ہے اور ہم آہنگ سرتال کے رچاؤ بہاؤ کے ساتھ کلاسیکی موسیقی میں بھی موجود ہے اور حیرت انگیز خوش منظری کے ساتھ دائرے میں جنم لینے والی یہی ہم آہنگی Rhythem تشاکل Symmetry کی صورت مسلمانوں کے فن تعمیر کا حصہ ہے جس کی لاجواب مثال تاج محل آگرہ ہے جو نہ صرف دائرے کی پیداوار ہے بلکہ درمیان میں نہ نظر آنے والا قطر اس دائرے کو دو متشاکل جزواں حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور اس پر آرائش اور خطاطی کے عمل نے اسے دنیا بھر میں سات مسلمہ عجوبوں میں سے ایک عجوبہ بنا دیا ہے۔

یہاں یہ ذکر مزید دلچسپی کا باعث ہوگا کہ دور حاضر میں طبعی سائنس کی تحقیق جدید بتدریج اس وحدت کی طرف بڑھ رہی ہے۔ سائنس کے سابقہ نظریات کے مطابق کائنات میں چار قوتیں ہیں (کشش ثقل، برقی قوت، جوہری قوت، کمزور جوہری قوت) آخری دو قوتیں جدید ترین تحقیق کے تحت دراصل ایک ہی قوت ثابت ہوگئی ہیں جبکہ بقیہ دو کی بھی صورت حال Unification of forces کے تحت یہی ثابت ہوتی نظر آتی ہے اور سائنس دان برملا اشارے دے رہے ہیں کہ دراصل کائنات میں ایک ہی قوت ہے دیگر اسی کے مظاہر ہیں۔ یہ ریسرچ آخری مرحلے میں ہے۔ وحدت کے حوالے سے اسی دائرے پر نظر رکھتے ہوئے اب غالب کے اس شعر پر آیئے۔ شاید وہ اسی دائرے کے متعلق ہے:

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے، اور جزو میں کل
کھیل بچوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

آرائشی مصوری جو موجد کے عمل کی ابتدا تھی، اپنا پورا دائرہ مکمل کرتے کرتے لامحالہ اپنی ارتقائی شکل میں اسلامی خطاطی پر پہنچی کیونکہ موجد باہر سے کیسے بھی روپ بہروپ میں رہا ہو لیکن اندر سے سو فیصد گدڑی پوش درویش ہے اور اس درویش کو اپنے دائرے کا عمل مکمل کر کے بالآخر کل میں شامل ہونا تھا اور یہ نقش آخر کلاسیکی اسلامی مصوری ہے۔

﴿۲﴾

اب ہم باقاعدہ طور پر اسلامی رسم الخط کی طرف آتے ہیں تاکہ پورے پس منظر کے تناظر میں موجد کی خطاطی کا احاطہ کر سکیں۔

مصر، بابل اور چین کے ہزاروں سال پرانے اور پیچیدہ طرز تحریر کے برعکس عربی رسم الخط جدید زمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ عرب خانہ بدوش ہونے کی حیثیت سے تحریر کی بجائے کلامی لفظ شناسی کے عادی تھے۔ قبل از اسلام تحریر کا خصوصی اعزاز صرف ان سات شعری شاہکاروں ODES کو حاصل تھا جنھیں سال کا بہترین کلام گردانتے ہوئے 'المعلقات' کے زیر عنوان کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کیا جاتا تھا۔ ورود اسلام کے بعد جب جنگوں میں بہت سے حفاظ صحابہ کرام رحلت فرما گئے تو حضرت عمرؓ کی تحریک پر حضرت ابوبکر صدیقؓ (خلیفہ اول) کے حکم پر قرآن کا حفاظ کے ذہنوں سے صفحات پر ضبط تحریر میں لانے کا عمل شروع ہوا اور محیر العقول رفتار سے یہ رسم الخط ایک عظیم الشان فن میں تبدیل ہونا شروع ہوگیا۔ مسلمانوں کی قرآن سے وابستگی نے اسے وہ تقدس اور شکوہ دیا کہ اس کے ابتدائی دور کے محررین میں حضرت عمر ابن الخطابؓ، حضرت عثمان ابن عفانؓ، حضرت علی ابن ابی طالبؓ، حضرت طلحہ ابن عبداللہؓ، حضرت ابوعبداللہؓ، حضرت معاویہ ابن ابوسفیانؓ جیسی مقدر اور معزز ہستیاں شامل ہیں۔

جانداروں کی تصویر کشی کی بندش سے مسلمان فنکاروں کا رخ آرائشی مصوری کی طرف ہوگیا۔ چونکہ اسلام ایک نظام کا نام ہے رسومات یا منتشر روحانی جملات کا نہیں۔ اس لیے مسلمانوں کے ہر تعمیری عمل کی بنیاد نظام سے وابستہ ہے۔ جیسے بالائی بیان میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ دیگر فنون کے علاوہ آرائشی مصوری نے اقلیدی عمل میں ارتقاء حاصل کیا اور اسے ایک قسم کی منظم سائنس بنا دیا۔ اسی طرح آرائشی مصوری نے جب خطاطی سے آمیزش کی تو اسے بھی کم بیش سائنسی اصولوں سے سرفراز کیا۔

خطاطی کو تخلیقی نظم سے آشنا کرنے کا قابل رشک مقام ابوعلی محمد ابن مقلہ کو حاصل ہے جس کے نظام کو 'مصباح فاضلہ' کا نام دیا گیا ہے۔ ابن مقلہ عباسی دور میں نویں صدی کے اواخر میں وزیر بھی تھے اور ایک بڑے خطاط بھی۔ بطور خطاط تخلیقی سائنسی اصولوں کا موجد ہونے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ ابن مقلہ نے خط نسخ رثلث کی رواں دواں بنیادی خاصیت کے حامل اس دور کے قریباً بیس رسم الخط میں ترتیب و توازن کا نظام داخل کرنے کا یوں اہتمام کیا کہ عربی حروف اور خالق کائنات کے نام کا پہلا حرف الف (ا) پیمائش کا پیمانہ بنا دیا۔ اس مقصد کے لیے نقطہ کی مخصوص جسامت کو اکائی کا درجہ دے کر اسے 'قط' کا نام دیا اور الف کی لمبائی کو آٹھ قط تفویض کر کے اسے مذکورہ دائرے کا قطر بنایا اور قطر کے دو طرفہ دائرے کے آدھے آدھے گھیراؤ کو ۱۲-۱۲ قط میں تقسیم کیا، اور یوں دائرے کا کل گھیراؤ ۲۴ قط پر متعین کیا۔ حالانکہ وہ اصلاً 25/1/4 ہے۔ حروف ب ت ث کو ان کی اپنی اپنی حالت میں الف کی آٹھ قط کی لمبائی عطا کی جبکہ دائرہ دار حروف 'ج ح خ' کو دائرے کے گھیراؤ کا نصف یا چوتھائی اور ان حروف کے بالائی سروں کو الف کے نصف کا پابند کیا۔ اسی طرح دیگر حروف کو ان کی مناسبت سے قط میں سمیٹا اور خط نسخ رثلث کی اختراعی اقسام میں (جن کے نام ذیلی نقشہ میں درج ہیں) الف اور دائرے کا قطر بھی مکمل جامد نہیں۔ خط نسخ کی ایک قسم نسخی اور خط رقاع میں اعلیٰ الترتیب الف کے قط کی تعداد چھ اور تین ہے۔ ایسی تبدیلی کا انحصار حروف کی افقی یا عمودی حالتوں سے ہے۔ اس تمام تر

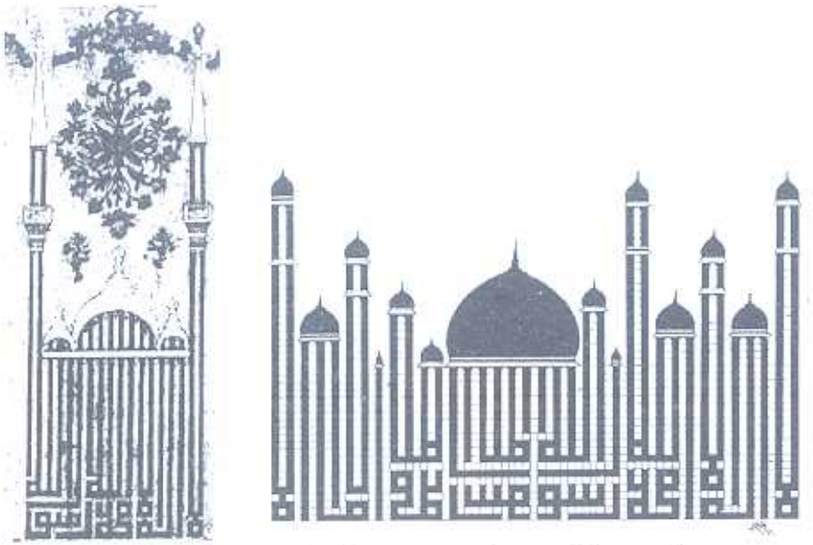

اب میں اپنے انہی چند بیان کردہ نکات کی مزید وضاحت کے لیے ایک صوری کمپوزیشن جو زمانہ قدیم سے تعلق رکھتی ہے۔ موجد کی ہو بہو اسی ڈھب کی صوری کمپوزیشن کے مقابل لاتا ہوں۔

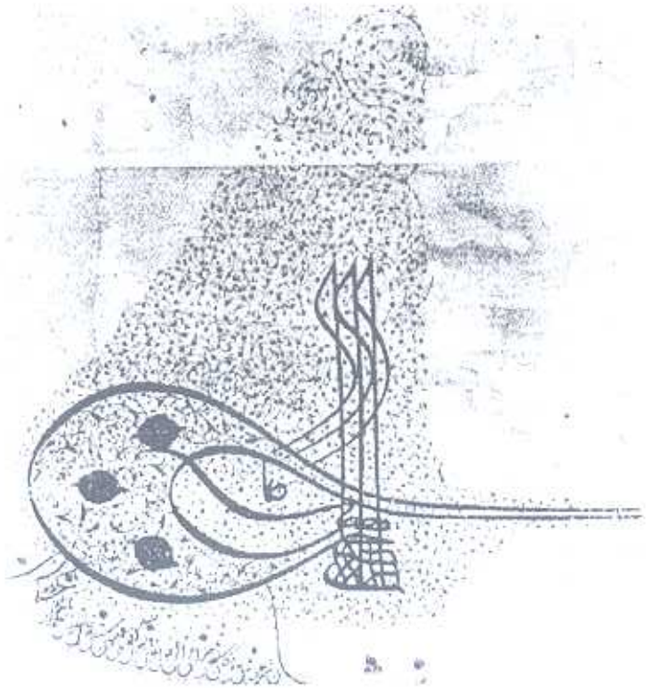

دونوں تخلیقی نمونے ایک ہی انداز کی پیداوار ہیں۔ ان دونوں کے تقابل سے یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ کلاسیکی حسن

سے مملو خطاطی کے طغرا کی روایت جدید تخلیقی عمل کے مقابل آ کر ارتقا کا اصل مفہوم کیسے واضح کرتی ہے۔ زیرنظر (بائیں) قدیم شاہکار جو قلم کی موسیقانہ گردشوں سے ابھرتا ہے اور آرائشی خط دیوانی کی پیداوار ہے یہ طغرا عثمانی سلطان سلیمان اعلیٰ (۱۵۲۰۔۶۶) کا چٹھی نامہ ہے۔ جس کے چاروں رخ قلم کی چند گردشیں ایک نغمہ سا پیدا کرتی ہیں جو کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

اس کے مقابل (دائیں) موجد کا طغرا ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ویسے ہی خطوط کے موسیقانہ لہراؤ اور بہاؤ میں موسیقی کے سروں میں ڈھلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بظاہر دونوں عمل مصوری میں گہری مماثلت ہے لیکن باریک بینی سے دونوں میں اترتے جائیں تو دونوں کے قلم کی علیحدہ علیحدہ مترنم حرکتوں میں علیحدہ علیحدہ لذت نظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ دونوں طغرے علیحدہ علیحدہ حرکات قلم کا لاجواب نمونہ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ترکی کے قدیم خطاط نے تصویر میں مصورانہ عمل سے جو پس منظر دیا ہے اس سے اس کا تاثر موجد کی تصویر سے بڑھ جاتا ہے۔ موجد بھی اگر ایسا کوئی مصورانہ انداز اختیار کرتا تو عین ممکن ہے اپنے انفرادی عمل کو محض نقالی کی نذر کرنے کا مرتکب ہوتا جو اسے قطعاً گوارا نہیں۔ یہ اس کے سارے کام سے عیاں ہے۔ لیکن موجد نے دوسرے رخ سے کمال یہ دکھایا کہ عثمانی مصور کسی عبارت کا پابند نہیں، آزاد ہے۔ موجد نے عبارت کی پابندی کو قبول کرتے ہوئے خطوط کو موسیقانہ آزادی دی۔

﴿۴﴾

اب خط کوفی سے خط ثلث کی طرف آتے ہیں۔ ثلث میں موجد کے قلم کی بوقلمونی دیدنی ہے۔ ثلث کے خالص عمل سے پہلے جو بسم اللہ کے قریباً سو روپ میں پھیلا ہوا ہے۔ موجد کی مصورانہ خطاطی کا ہلکا سا جائزہ لیتے ہیں۔ اس میں بھی ثلث کو بہت دخل حاصل ہے۔

موجد کی مصورانہ خطاطی کی تمام تصاویر کا مجموعی تاثر چار خصوصیات کا نمایاں طور پر مظہر ہے۔ پہلی جسے اہم ترین خوبی کہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ حروف پر مصورانہ عمل اس انداز سے کیا گیا ہے کہ ان حروف کے بطن سے ان کے معنی خود بخود ابھرتے ہیں۔ اس نے جو بسم اللہ پر تخلیقی عمل کیا ہے وہ اس کی ساری مصوری کا حاصل ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک پرمعنی قسم کے رنگوں میں ملفوظ پس منظر سے اس نے بڑی مہارت سے مخلوط رنگوں کی آمیزش سے جو معنوی فضا پیدا کی ہے الفاظ کو ان کے اندر سے یوں نکالا ہے کہ وہ سو فیصد فضا کا حصہ بھی ہیں اور خود بھی اپنے علیحدہ وجود میں فضا کی پوشیدہ معنویت سے مملو ہیں۔ فضا اور الفاظ کا یہ باہمی ربط نظر کو بکھرنے نہیں دیتا۔

قدیم کلاسیکی رخ پر ایسا ہی ایک انتہائی خوبصورت عمل سن ۱۳۰۶ عیسوی میں فارس (ایران) میں طبع شدہ قرآن کی سورہ انفال میں کیا گیا ہے۔ گو اس کا عکس صاف نہیں لیکن تاثر سے حسن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس تصویر میں بادلوں کی فضا سے الفاظ ابھرتے بھی ہیں اور اس فضا کا حصہ بھی ہیں۔

جو مفہوم اس تصویر میں ابھارا گیا ہے وہ آیت کے اس حصے سے تعلق رکھتا ہے۔

''اور وہ وقت جبکہ اللہ اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان و بے خوفی کی کیفیت طاری کر رہا تھا اور آسمان سے تم پر پانی برسا رہا تھا۔ تا کہ تمہیں پاک کر کے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کرے اور تمہاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعے تمہارے قدم جما دے''۔

تصویر کا پر معنی پہلو یہ ہے کہ آیت پر جو تحریر ہے وہ بظاہر مذکورہ آیت سے پیدا شدہ پس منظر سے متعلق نہیں۔ وہ آیت نمبر ۴۱ سے متعلق ہے جو ''والیتٰمی و المسکین'' سے شروع ہوتی ہے۔ حسن اتفاق ہے کہ زیر غور مصور اور موجد کی خطاطی کا محرک 'فن برائے زندگی' ہے جو مکمل طور پر قرآن کے پیغام سے مربوط ہے محض آرائش سے نہیں۔ انفال جمع ہے نفل کی۔ عربی میں نفل اس چیز کو کہتے ہیں جو واجب یا حق سے زائد ہو۔ تصویر کے پس منظر میں مصور نے اللہ تعالیٰ کا وہ احسان بتایا ہے جو اس نے بادلوں کی صورت مسلمانوں کو جنگ میں فتح کے لیے ان پر نازل کیا اور تحریر میں یتیموں اور مسکینوں کا حصہ دینے کا حکم دیا ہے۔ اس مال غنیمت سے جو مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی مدد سے جنگ (بدر) میں حاصل ہوا جو ان کے حق سے متجاوز ہے خط ثلث میں قدیم مصور نے اس مصورانہ تصویر میں پوری سورۃ انفال کا مفہوم سمو دیا ہے۔ مصورانہ خطاطی کا صحیح مقصد قدیم دور میں بھی یہی تھا اور اب بھی صرف اور صرف یہی ہونا چاہیے۔ محض فن تراشی کی اس فن میں گنجائش نہیں۔ یہ قرآن سے مذاق کے مترادف ہے اور نہ ہی ایسے مکینیکل فن سے مصورانہ خطاطی کو فروغ حاصل ہوگا۔ فارس کا چودھویں صدی کا قدیم مصور اور پاکستان کا اکیسویں صدی کا مصور دونوں ایک ہی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس میں قابل غور اضافی بات یہ ہے کہ ۱۴ویں صدی کا مصور اور ۲۱ویں صدی کا مصور دونوں کے دل کی ڈوری عوام سے بندھی ہوئی ہے۔

موجد نے یہ عمل ثلث میں کیا ہے لیکن تحریک دسویں صدی کے مصر کے فاطمی دور سے اور اسی صدی کے افغانستان کے غزنوی دور کے خط کوفی سے لی ہے۔ فاطمی دور کے حوالے سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خط کوفی نے آرائشی رخ پر بے پناہ عروج حاصل کیا حتیٰ کہ حروف بھی آرائش میں ڈھالے جانے لگے اور آرائش کی یہ انتہا یہاں تک پہنچی کہ بارھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے قرآنی معنویت غائب ہوگئی۔ دسویں صدی میں کتبوں پر سنگ مرمر میں حروف کی تراش کو گولائی دے کر موٹا کیا گیا اور حروف کے خم اور سروں پر کبھی سادہ عمل یا فنی انداز میں کسی جانور کے سر کی شکل طوطے کا سر یا مع چونچ، بطخ کا جھکا ہوا سر یا چونچ، یا موٹائی میں تجریدی انداز میں حروف جو بت سے محسوس ہوں حتیٰ کہ انیسویں صدی میں آیات کو ایسی گردشوں سے تشکیل دیا جانے لگا کہ ان سے پورے کا پورا کسی پرندے یا جانور کا پیکر تیار ہو جاتا۔ گویا خطاطی میں 'فن برائے فن' کا پہلا مظہر تو خطاطی سے قرآن کی معنویت کو معدوم کرنے سے ہوا، پھر یہ دوسرا انتہائی عمل تو قرآنی پیغام کی بنیاد ہی الٹنے کے مترادف تھا۔ جو قرآن بت پرستی کے خلاف نازل ہوا اسی قرآن کی آیات سے بت تراشے جانے لگے۔

موجد نے ایسی اختراعات سے صرف تحریک لی ہے لیکن اختراعی عمل اپنے انداز میں اختیار کیا ہے جو اس کا مخصوص خط بین گیا ہے۔

۵

اب ہم موجد کی خطاطی کی اس منزل پر پہنچتے ہیں جو اس کے قلمی سفر کی ساری ریاضتوں کا حاصل ہے۔ وہ قلم جسے اس نے پہلی دفعہ جھجکتے ہاتھوں دیواری آرائش پر دھرے ہوئے ٹریسنگ پیپر پر رکھا تو اس کی انگلیوں میں ہلکی سی لرزش تھی، آج اس قلم پر

اسے وہ قدرت حاصل ہے کہ اس کی حیرت ناک گردشوں سے ''بسم اللہ'' کی ایک سو ایک صورتیں سیاروں کی طرح جنم لے کر اپنے ہی مصورانہ طرز کے آفاق کی کہکشاں تخلیق کر چکی ہیں کہ جسے خطاطی کے آفاق شناس کبھی نہ کبھی، کوئی نہ کوئی مخصوص اور موزوں نام ضرور دیں گے جیسے صادقین نے اپنے ایک مسلسل عمل کو 'لوح قرآن سورۃ رحمٰن' کا نام دیا۔

'لوح بسم اللہ' کے ان ایک سو ایک جدا جدا روپ سے ابھری ہوئی اس کہکشاں میں ہر ماہ پارہ اپنی صورت میں یکتا ہے کوئی اس کا مثل نہیں، اس کہکشاں میں بکھری ہوئی نظر کو کسی ایک پر روکنا، روح کی جمال پیمائی کو زنجیر ڈالنے والی بات ہے۔ لیکن اس طویل گفتگو کو سمیٹنے کے لیے نظر کا روکنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ اس لیے بر سبیل تذکرہ صرف چند تصویروں پر نظر روکی جاتی ہے۔ ابتدا خطاطی کے جدید روپ سے زیر نظر تصویر سے کی جاتی ہے۔ جہاں لفظ 'موجد' کی معنویت خطوط میں بولتی ہے۔

خطاطی کا یہ جدید ترین نقش دیکھیے جو چھ علیحدہ علیحدہ حصوں میں منقسم ہے لیکن Rhythm ایک ہے۔ ذرا اور باریک بینی سے دیکھیے، نچلے حصے میں دو طرف سروں پر ستونوں کی مانند ایستادہ 'م' اور اس کے سروں سے گھومتے ہوئے دائرے ایک تشاکل Symmetry پیدا کرتے ہیں جبکہ عین درمیان میں 'رحمٰن' کے دو طرفہ دو دو چھوٹے اور بڑے عمودی ڈنڈوں کی جوڑی اور اور بڑے ڈنڈے کی بنا سے جنم لیتی ہوئی خطوط کی لہریں دوسرا تشاکل ابھارتی ہیں اور چھ حصوں میں تقسیم گردش ان دو تشاکل کے ساتھ مجموعی طور پر ایک مکمل توازن میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ اب مجموعی طور پر اس تصویر پر نظر گاڑیے اور دیکھیے کہ لفظ 'موجد' کی معنویت کس انداز سے ان چھ قلمی گردشوں میں بولتی ہے۔

اب ان دو تصاویر پر نظر دوڑائیے ان کے نچلے حصے کی بندش کلاسیکی خطاطی کے خط ثلث Thuluth اور خط توقیع Tawqi (جو ثلث سے مماثل ہے) کے امتزاج کی مظہر ہے۔ نامعلوم سی جھلک (بائیں ہاتھ) زمینی حصے میں خط نستعلیق کی بھی ہے۔ جبکہ مجموعہ تصویر طرز جدید اور اختراعی اور موجدی عمل کی پیداوار ہے۔

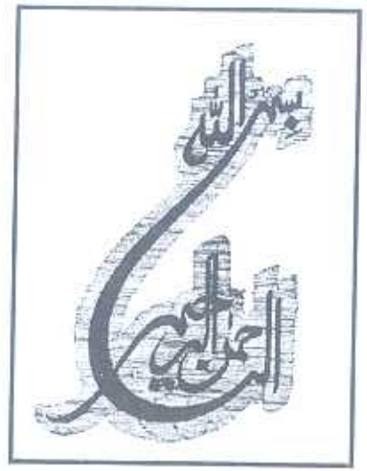

ان دونفن پاروں کی بندش دیکھیے اوپر آفاق میں اسم 'اللہ' 'م' (محمدؐ) کے راستے ایک لہر کی رو میں زمین پر 'رحمٰن' اور 'رحیم' کی صورت اتر رہا ہے اور 'م' کی یہ لہر ایک تصویر میں (دائیں) سیدھے اور دوسری میں بالائی الٹے رخ رو میں ہے۔ الٹے رخ لہر کی یہ گردش 'الرحمٰن' کی 'ر' میں مدغم ہو کر اوپر 'ل' کے عمودی حصے میں گم ہو جاتی ہے اور یوں سیدھے اور الٹے ہاتھ زمینی حصے میں خط کی گردش دو مختلف کمپوزیشن کی دلفریف صورتیں پیدا کرتی ہیں سیدھے ہاتھ الرحمٰن سے نکلتی دو لہریں اوپر 'م' سے آتی ہوئی لہر کے لہراؤ کے متوازی ایک ترنم Rhythm سا پیدا کرتی ہیں اور 'الرحیم' سے پھوٹتی ہوئی دو لہریں اس Rhythm میں شامل ہو کر نغمگی میں گہرائی کا باعث بن رہی ہیں۔

اب ہم آخر میں خالص کلاسیکی خطاطی (ثلث) کے تناظر میں قدیم اور جدید (موجدی) عمل کا ہلکا سا موازنہ کرتے ہیں۔ خط ثلث Thuluth ساتویں صدی عیسوی میں امیہ دور خلافت میں منظم کیا گیا۔ نویں صدی تک صحیح معنوں میں ارتقا پذیر ہوا۔ لفظ ثلث یعنی 'تیسرا' نام کی توضیح ثلثی (سیدھی) سطر کے حصص یا پھر ایک دوسرے ہم عصر معروف خط ثلث کے سائز کا 'تیسرا' تصور کیا جاتا ہے۔ یقین سے دونوں توجیحات کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ خط ثلث قرآن کی نقل میں بہت کم استعمال ہوا ہے لیکن بطور آرائشی خط کاری، عنوانات، سرنامہ وغیرہ کے کثرت سے استعمال ہوا ہے۔

ابھی تک آرائشی خطوط میں یہ سب سے اہم تصور کیا جاتا ہے، ابن مقلہ کے چھ Cursive Scripts (شکستہ رواں خط) جنھیں 'الاقلام الستہ'' سے موسوم کیا جاتا ہے کا یہ اہم ترین خط ہے۔ فارسی اور ترکی میں اس قلم قبیلہ کو 'شش قلم' کہا جاتا ہے۔ خط توقیع Tawqi اور رقاع Riqa اسی قلم قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے سے قریب ترین رشتہ ہے اور خط ثلث سے بہت گہری قربت کے حامل ہیں، توقیع نویں صدی عیسوی میں ایجاد ہوا اور عباسی خلفا نے اسے اسما اور سرناموں کے لیے فوری طور پر شاہی خط کے طور پر اپنا لیا۔ رقاع کی نسبت یہ افقی رخ طویل گردش سے طوالت پذیر ہوتا ہے۔ جز و جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور زمینی پھیلاؤ زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی کثرتی آرائشی قسم خط ثلث سے مماثلت پیدا کرتی ہے۔ یہ بہت آہستہ آہستہ ترقی پذیر ہوا ہے۔ اس کے جز و افقی طویل کی بجائے قلیل ہوتے ہیں۔ اس لیے اس نے مختلف رخ میں زیادہ ترقی حاصل کی اس کی ایک وجہ اس کی انتہائی سادگی ہے اور تمام دنیائے عرب کا آج کل یہی ترجیحی خط ہے۔

موجد نے اپنے مصورانہ عمل میں خط ثلث کو پیش نظر رکھا ہے خط توقیع کا بھی ہلکا سا عکس شامل ہے بلکہ جیسا کہ اوپر کہا گیا اس میں نامعلوم سی خط نستعلیق کی بھی کہیں جھلک ملتی ہے۔ اب ہم دور قدیم کے ابن مقلہ سکول سے متعلق خطاطی (ثلث) کے دو تین عظیم معماروں کے نمونے دیکھتے ہوئے موجد کی دو ایک تصاویر سے رجوع کرتے ہیں۔ ان نمونوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکے گا کہ ان کے عکس میں موجد نے کیا کیا اختراعی اور موجدی عمل کیا ہے۔ زیر نظر خطاطی (ثلث) کے نمونے دیکھیے۔

(اوپر سے نیچے) پہلا نمونہ (سورہ الفلق) ابن مقلہ کے اصولوں کو مکمل عملی صورتوں میں ڈھالنے والے خطاطی کے معمار عظیم ابن البواب (وفات ۱۰۲۲) کے قلم کی پیداوار ہے جو بغداد کے ایک قرآن سے اخذ کیا گیا ہے اور سورۃ کے سرنامہ کے طور پر تحریر ہے۔

دوسرا نمونہ قرآن کی سورۃ البقرہ کی آیت ہے جو اس مفہوم کی حامل ہے ''برق نے قریب قریب ان کی بینائی چھین لی'' خط ثلث میں لکھی گئی یہ آیت ترکی کے قدیم معروف مقتدر خطاط (سترھویں صدی) حافظ عثمان کے قلم کی پیداوار ہے۔

خط ثلث کا تیسرا نمونہ دور عثمانیہ کے سولہویں صدی کے سب سے بڑے خطاط شیخ حمد اللہ کا تحریر کردہ ہے جس کا مفہوم ہے ایک صاحب حکمت سے پوچھا گیا انکساری کیا ہے؟

یہ تینوں نمونے جو تاریخ خطاطی کے تین عظیم ترین خطاط کی تخلیق ہیں ان کی اہم ترین صفت یہ ہے کہ یہ ابن مقلہ کے قواعد وضوابط کی اعلیٰ ترین تفسیر کے مظہر ہیں۔ اب انہی قواعد وضوابط کی مکمل حدود میں 'بسم اللہ' کے دو نمونے دیکھتے ہیں۔ ابن مقلہ کے مذکورہ قلم قبیلہ کا رکن خط توقیع جو خط ثلث سے بہت مطابقت رکھتا ہے یہ تحریر اس سے متعلق ہے۔ اس کا تعلق ۱۰۲۰ عیسوی مقام قیروں سے ہے۔ جبکہ اس سے نچلا نمونہ خط ثلث میں ابن البواب کے مخصوص طرز (سٹائل) کا مظہر ہے۔ یہ دونوں نمونے ابن مقلہ کے

قواعد کی مکمل تفسیر ہیں، مصورانہ خطاطی کے تحت موجد نے جو اختراعی عمل کیا ہے اسے سمجھنے میں ان بنیادی نمونوں سے مدد ملے گی۔

حسن قدیم کے روپ کے اس تناظر میں موجدی قلم کے دو مظاہر سامنے لاتے ہیں جو ابن مقلہ کے قواعد کے مقلد نہیں لیکن اس حسن کے دائرے سے بھی باہر نہیں گو اس مصورانہ عمل میں قلم کو ایک حد تک آزادی حاصل ہے۔ لیکن ایک دوسرے انداز میں یہی آزادی ایک اور قسم کے اوزان میں تبدیل ہوگئی ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے موجد کی چند تصاویر میں ایسے توازن و تشاکل کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔

قدیم و جدید حسن خطاطی کی نمائش نظروں کے سامنے ہے۔ دونوں میں مشترک اقدار کیا ہے، انہیں بغیر کسی تبصرے کے اپنی اپنی نظر اور اپنے اپنے خیال کے لیے چھوڑ دیا ہے، اسی طرح آخر میں دور حاضر کے برصغیر کے مقتدر مصور صادقین کی مصورانہ خطاطی کا ایک نمونہ اور اسی طرز کی کمپوزیشن میں موجد کی مصورانہ خطاطی کی مظہر ایک تصویر لذت نگاہ کے لیے نیچے دی جا رہی ہے کیونکہ دونوں تصویریں اپنی اپنی جگہ ایک مسلسل عمل کی پیداوار ہیں، صادقین نے سورۃ رحمٰن کو مصور کرتے ہوئے سورۃ میں متواتر دہرائی گئی اس آیت "فبای الاء ربکما تکذبن" کو اکتیس مصورانہ شکلیں دی ہیں۔ جبکہ موجد نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ایک سو ایک اشکال میں مصور کیا ہے۔

دونوں کا عمل ابن مقلہ کے وضع کردہ چھ خطوط کے زیر اثر لایا گیا ہے۔ صادقین نے چند مقامات پر (سادہ) خط کوفی میں مذکورہ آیت کو بھی ڈھالا ہے۔ موجد کے عمل پر غالب اثر خط ثلث کا ہے جبکہ صادقین کے عمل پر غالب اثر خط ریحانی کا ہے۔ یہاں دونوں کا عمل طغرا سے مماثل ہے، دونوں نے پوری قدرت کے ساتھ قلم کو آزادانہ گردشیں دی ہیں۔ لیکن ان کا عمل ان کے اپنے اپنے انداز کے توازن و تشاکل میں ڈھلا ہوا ہے۔ دونوں کسی قسم کی تجریدیت کا شکار نہیں۔ کیونکہ دونوں نے طویل فنی ریاضت سے قلم پر قدرت حاصل کی ہے۔ ان کے قلم کی تمام گردشیں اپنا اپنا مصورانہ نظم لیے ہوئے ہیں۔ ان کی مثال آزاد معرا نظم کے ان ماہر شاعروں سے دی جا سکتی ہے جو اپنی شاعرانہ طویل ریاضت کے طفیل غزل پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن قافیہ، ردیف سے آزادی حاصل کرتے ہیں تو بحر کی پابندی میں ایک قسم کے وزن کو پورے غزل کے سے غنا میں بدل دیتے ہیں، اسی طرح تجریدیت کو مصوری میں قلم کے جو شاہسوار شامل کرتے ہیں وہ ایک اپنی قسم کا نظم یا اپنی قسم کی کمپوزیشن تخلیق کرتے ہیں جس طرح چغتائی اپنے مصورانہ پیکروں میں تجریدیت کی ہلکی سی آمیزش سے ان پیکروں میں جمال کا ایک نیا انداز ابھارتا ہے۔ اسی طرح مغرب میں تجریدیت کے بانیوں میں سے سرخیل مصور پکاسو کے ابتدائی تجریدی عمل میں یہی کیفیت محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس کی ابتدائی مصورانہ ریاضت کا سپین میں (اوائل زندگی گزارنے کی وجہ سے) مسلمانوں کی اقلیدی مصوری سے گہرا رابطہ رہا ہے اور مصوری کے ماہرین اس کا برملا اعتراف کرتے ہیں۔

کسی فن کے نظام میں طویل ریاضت کے بعد جو بھی تخلیق کار کسی آزادانہ عمل کا موجب بنتا ہے، وہ اپنی ہی پیدا کردہ بے ترتیبی میں ایک اور قسم کی ترتیب کا حسن داخل کر دیتا ہے۔ یہ اعزاز انہی معدودے چند تخلیق کاروں کو حاصل ہوتا ہے۔ جو اقبال کے اس مصرع پر پورے اترتے ہیں۔

معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

(ماخوذ، بہ ترمیم و تلخیص)

غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں

کنہیالال کپور

(دور جدید کے شعرا کی ایک مجلس میں مرزا غالبؔ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر جدید شعرا تشریف فرما ہیں۔ مثلاً م۔ن ارشد، ہیرا جی، ڈاکٹر قربان حسین خالص، میاں رفیق احمد خوگر، راجہ عہد علی خاں، پروفیسر غیظ احمد غیظ، بکرماجیت درما، عبدالحی نگاہ وغیرہ وغیرہ۔ یکا یک مرزا غالب داخل ہوتے ہیں۔ ان کی شکل وصورت بعینہٖ وہی ہے جو مولانا حالیؔ نے ''یادگار غالب'' میں بیان کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں ''دیوان غالب'' کا ایک نسخہ ہے۔ تمام شعرا کھڑے ہو کر آداب بجالاتے ہیں)

غالب: حضرات میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ دور جدید کے شعرا سے شرف نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر: یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے وگرنہ

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب: رہنے بھی دیجیے اس بے جا تعریف کو۔ من آنم کہ من دانم

دوسرا شاعر: تشریف رکھیے گا۔ کہیے جنت میں خوب گزرتی ہے۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن.....

غالب (مسکرا کر): بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے۔ جب میں وہاں گیا ہوں ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر: تعجب! جنت میں تو آپ کو کافی فراغت ہے اور پھر ہر ایک چیز میسر ہے۔ پینے کو شراب، انتقام لینے کو پری زاد اور اس پر یہ فکر کوسوں دور کہ

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

باوجود اس کے آپ کچھ لکھ.....

تیسرا شاعر (بات کاٹ کر): سنایئے اقبال کا کیا حال ہے؟

غالب: وہی جو اس دنیا میں تھا۔ دن رات خدا سے لڑنا جھگڑنا۔ وہی پرانی بحث:

مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

پہلا شاعر: میرے خیال میں وقت کافی ہو گیا ہے۔ اب مجلس کی کارروائی شروع کرنی چاہیے۔

دوسرا شاعر: میں کرسیٔ صدارت کے لیے م۔ن ارشد کا نام تجویز کرتا ہوں۔

(ارشد صاحب کرسیٔ صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کرتے ہیں)

م۔ن ارشد: میرے خیال میں ابتدا مرزا غالب کے کلام سے ہونی چاہیے۔ میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا کلام پڑھیں۔

غالب: بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائے گی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر سنا دیں گے۔

م۔ن ارشد: معاف کیجئے گا مرزا۔ اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں جائے گی۔ شمع کی بجائے یہاں پچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے۔ اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالب: بہت اچھا صاحب تو غزل سنیے گا۔

باقی شعرا: ارشاد!

غالب: عرض کیا ہے:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

(باقی شعرا ہنستے ہیں۔ مرزا حیران ہو کر ان کی جانب دیکھتے ہیں)

اجی صاحب یہ کیا حرکت ہے نہ داد نہ تحسین۔ اس بے موقع خندہ زنی کا مطلب؟

ایک شاعر: معاف کیجیے مرزا ہمیں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔

غالب: بے معنی؟

ہیرا جی: دیکھئے نا مرزا آپ فرماتے ہیں:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا اور اگر آپ صرف معشوق کے نام کے ہی عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا ضروری ہے؟ سادہ کاغذ پر اس کا نام لکھ لیجیے۔

ڈاکٹر قربان حسین خالص: میرے خیال میں اگر یہ شعر اس طرح لکھا جائے تو زیادہ موزوں ہے:

خط لکھیں گے کیونکہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو
جس طرح سے میری اک اک نظم کا
کچھ بھی تو مطلب نہیں
خط لکھیں گے کیونکہ الفت ہے ہمیں
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں
یعنی عاشق ہیں تمہارے نام کے

غالب: یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے آپ میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے ہیں:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہیراجی: جنوں! جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے اگر اجازت ہو تو کہوں۔

غالب: ہاں! ہاں! بڑے شوق سے۔

ہیراجی: عرض کیا ہے:

جنوں ہوا، جنوں ہوا
مگر کہاں جنوں ہوا
کہاں ہوا وہ کب ہوا
ابھی ہوا یا اب ہوا
نہیں ہوں میں یہ جانتا
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق تھا
تو بس یہی ہے وجہ کہ
دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہوا، جنوں ہوا

غالب: (ہنسی کو روکتے ہوئے): سبحان اللہ کیا برجستہ اشعار ہیں۔

م۔ن ارشد: اب مرزا، غزل کا دوسرا شعر فرمایئے۔

غالب: میں اب مقطع ہی عرض کروں گا۔ کہا ہے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحی نگاہ: گستاخی معاف مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔

غالب: کس طرح؟

عبدالحی نگاہ:

عشق نے، ہاں ہاں تمہارے عشق نے
عشق نے، سمجھے! تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا
اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیا بکتا ہوں میں
یعنی نکما کر دیا
اتنا تمہارے عشق نے
گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
یعنی تمہارے عشق نے
اتنا نکما کر دیا

غالب (طنزاً): بہت خوب، بھئی غضب کر دیا۔

غیظ احمد غیظ: اور دوسرا مصرع اس طرح لکھا جا سکتا تھا:

جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی
اور آدمی تھا کام کا
لیکن تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا

غالب: واللہ۔ کمال ہی تو کر دیا بھئی۔ اب آپ لوگ اپنا اپنا کلام سنائیں۔

م۔ن ارشد: اب ڈاکٹر قربان حسین خالص جو جدید شاعری کے امام ہیں۔ اپنا کلام سنائیں گے۔

ڈاکٹر خالص: اجی ارشد صاحب میں کیا کہوں اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں۔ آپ جدید شاعری کی منزل ہیں اور میں سنگ میل۔ اس لیے آپ اپنا کلام پہلے پڑھیے۔

م۔ن ارشد: توبہ! توبہ! اتنی کسر نفسی۔ اچھا اگر آپ مصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے "بدلہ"۔ عرض کیا ہے:

آ مری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کے آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے
جس طرح دور کسی دشت کی پہنائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرم شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں
ایسی تشبیہ کی لذت سے مگر دور ہے تو
تو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا

اپنے بے کار خدا کے مانند
دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خودکشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور چپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

آ مری جان میرے پاس انگیٹھی کے قریب
تا کہ میں چوم ہی لوں عارض گلفام ترا
اور ارباب وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شب عیش گزر جانے پر
بہر جمع درم و دام نکل جاتا ہے
ایک بوڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھوڑ کر بستر سنجاب و سمور

(نظم سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ ہیرا جی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس میں انگیٹھی، بھوت اور دفتر تہذیب و تمدن کی مخصوص الجھنوں کے حامل ہیں)

(حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہیں)

غالب: ارشد صاحب معاف کیجیے آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے۔

غیظ احمد غیظ: یہ صرف ارشد پر ہی کیا منحصر ہے۔ مشرق کی جدید شاعری ایک بڑی حد مبہم اور ادراک سے بالاتر ہے۔

م۔ن ارشد: مثلاً میرے ایک دوست کے اس شعر کو لیجیے۔

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو!
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

اب بتایئے اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

غالب (شعر کو دہرا کر): صاحب سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں مگر باوجود ان کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ن ارشد: اجی چھوڑیے اس طرف گیری کو۔ آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں، مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالص: میری نظم کا عنوان ہے "عشق"۔ عرض کیا ہے۔

عشق کیا ہے؟
میں نے اک عاشق سے پوچھا
اس نے یوں رو کر کہا
عشق اک طوفان ہے
عشق اک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلۂ جوالہ..... عشق
عشق ہے پیغام موت!

غالب: بھئی یہ کیا مذاق ہے۔ نظم پڑھیے۔ مشاعرے میں نثر کا کیا کام۔

ڈاکٹر خالص (جھنجھلا کر): تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے؟ یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم اور فرمایا تھا آپ نے

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرف دار نہیں

غالب: میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے۔ نہ ترنم، نہ قافیہ نہ ردیف۔

ڈاکٹر خالص: مرزا صاحب! یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا۔ ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا ہے اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کیے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ میری مراد رفعت تخیل، تازگی افکار سے ہے۔

غالب: رفعت تخیل، کیا خوب، کیا پرواز ہے:

میں نے اک عاشق سے پوچھا
اس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص (چڑ کر) عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالب: مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رفیق احمد خوگر: اس کی وجہ مغربی شعرا کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے۔ اس کے علاوہ دور جدید کی روح، انقلاب، کشمکش، تحقیق، تجسس، تعقل پرستی اور جدوجہد سے ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے اور میرے اس نکتے کو تھیکرے نے بھی اپنی کتاب وینٹی فیئر میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسی لیے ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ روح میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔ قدیم شعرا اور جدید شعرا کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم شعرا بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار۔

غالب: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ن ارشد: خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو، ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والے بموں کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن و عشق، گل و بلبل، شیریں فرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کر سکتے۔ شاعری کے لیے اور بھی موضوعِ سخن ہیں جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا:

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سایے تلے
آدم و حوا کی اولاد پر کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے
یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر اک سمت پراسرار کڑی دیواریں
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے

راجہ عہد علی خان: بہت خوب: ''یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے'' ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون ''ڈاک خانہ'' ہے جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا، موضوع ہے۔

غالب: ڈاک خانہ؟

راجہ عہد علی خان: مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ سنیے! عرض کیا ہے:

ڈاک خانے کے ہے اندر آج اف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اف آدمی
ان میں ہر اک کی تمنا ہے کہ وہ
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اس کی سائیکل
ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر اسے
ڈاک خانے میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے
جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو
بمبئی کو، مصر کو، لندن کو اور کوہ قاف کو
دیکھنا۔ آئی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے
کون کہتا ہے کہ اک عورت ہے یہ
یہ تو لڑکا ہے کسی کالج کا کہ
جس کے بال
خدوخال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم
اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل
اف ہماری لغزشیں
ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام
جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا
یا ہمارے ہے تمدن کا قصور
کہ ہمارے نوجوان
ڈاک خانے میں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں
کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں

(زوروں کی داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مرحبا، بھئی کمال کر دیا، کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کی سراسیمگی ہر لحہ بڑھتی جا رہی ہے)

م۔ن ارشد: اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غیظ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غیظ: میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

ہیرا جی: تو پھر وہی نظم سنا دیجیے جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔

پروفیسر غیظ: آپ کی مرضی، تو وہی سن لیجیے۔ عنوان ہے ''لگائی''۔

فون پھر آیا دل زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرو چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمۂ و نالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران میں اکثر مصرعے دو دو بلکہ چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر غیظ بار بار مرزا غالب کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب مبہوت ہیں)

م۔ن ارشد: حضرات! میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے ملک کے اینٹی فائشسٹ جذبے کو خوب

نبھایا ہے۔

رفیق احمد: (سرگوشی کے انداز میں ہیراجی سے): بکواس ہے۔

م۔ن ارشد: اب ہیراجی اپنا کلام پڑھیں گے۔

ہیراجی: میری نظم کا عنوان ہے ''بینگن''۔

غالب: بینگن؟

ہیراجی: بینگن۔ اگر آپ آم کی صفت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں تو کیا بندہ بینگن پر نظم لکھنے کا حق دار نہیں؟

غالب: معاف کیجیے گا۔ نظم پڑھیے۔

ہیراجی: عرض کیا ہے: ؎

چنچل بینگن کی چھب نیاری
رنگ میں تم ہو کرشن مراری
جان گئی ہیں سکھیاں پیاری
رادھارانی آ ہی گئی تو
کرشن کنہیا دھونڈھ رہے ہیں
لیکن میں تو بھول چکا ہوں
بینگن سے یہ بات چلی تھی
بھوک لگی ہے کتنی ہائے
جی میں ہے اک بھون کے بینگن
کھاؤں لیکن رادھا پیاری
رنگ کو اس کے دیکھ کے مجھ کو
یاد آتے ہیں کرشن مراری
اس لیے بھوکا رہنا بہتر
چونکہ میں ہوں پریم پجاری

(ہر طرف سے داد دی ہے۔ بعض شعرا یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں بھئی جدید شاعری ہیراجی کا ہی حصہ ہے)

م۔ن ارشد: اب جناب بکرماجیت صاحب ورما سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنا کلام سنائیں۔

بکرماجیت ورما: میں نے حسب معمول کچھ گیت لکھے ہیں۔

غالب: (حیران ہو کر) شاعر اب گیت لکھ رہے ہیں۔ میرے اللہ دنیا کدھر جا رہی ہے۔

بکرماجیت ورما: مرزا آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دیے گئے تھے۔ دور جدید کے شعرا نے انہیں ایک قابل عزت صنف کا درجہ دیا ہے۔

غالب: جی ہاں ہمارے زمانے میں عورتیں، بھانڈ، میراسی یا اس قماش کے اور لوگ گیت لکھا کرتے تھے۔

بکرماجیت ورما: پہلا گیت ہے ''برہن کا سندیس'' عرض کیا ہے:

اڑ جا دیس بدیس رے کوے اڑ جا دیس بدیس
سن کر تیری کائیں کائیں

غالب: خوب: سن کر تیری کائیں کائیں

بکرماجیت ورما: عرض کیا ہے ؎

سن کر تیری کائیں کائیں
آنکھوں میں آنسو بھر آئیں
بول یہ تیرے من کو بھائیں
مت جانا پردیس رے کوے اڑ جا دیس بدیس

م۔ن ارشد: بھئی کیا اچھوتا خیال ہے پنڈت صاحب۔ میرے خیال میں ایک گیت آپ نے کبوتر پر بھی لکھا تھا۔ وہ بھی مرزا کو سنا دیجیے۔

بکرماجیت ورما: سنیئے پہلا بند ہے۔

بول کبوتر بول
دیکھ کوئلیا کوک رہی ہے
من میں میرے ہوک اٹھی ہے
کیا تجھ کو بھی بھوک لگی ہے
بول غڑغوں بول۔ کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعرا (ایک زبان ہو کر): بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول

(اس اثنا میں مرزا غالب نہایت گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں)

بکرماجیت ورما: اب دوسرا بند سنیئے: ؎

بول کبوتر بول
کیا میرا ساجن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے
کیوں میرے طعنے سہتا ہے
بھید یہ سارے کھول۔ کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعرا (ایک زبان ہو کر): بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول

(اس شور وغل کی تاب نہ لا کر مرزا غالب بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

کتب موصولہ برائے تبصرہ

شہناز مزمل

۱۔ نذرِ غالب ر ڈاکٹر وحید قریشی ۔۔۔ کراچی: ادارہ یادگارِ غالب، ۲۰۰۴ء، قیمت۔/150 روپے
۲۔ آہنگِ پنجم ر پرتو روہیلہ ۔۔۔ کراچی: ادارہ یادگارِ غالب، ۲۰۰۴ء، قیمت۔/250 روپے
۳۔ میرے جیون کی کچھ یادیں (خودنوشت) ر ڈاکٹر زیڈ اے احمد ۔۔۔ کراچی: ادارہ یادگارِ غالب، ۲۰۰۴ء، قیمت۔/200 روپے
۴۔ الست ر منیر سیفی ۔۔۔ لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۴ء، قیمت۔/150 روپے
۵۔ تنکے کا باطن ر پروین طاہر ۔۔۔ لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۵ء، قیمت۔/120 روپے
۶۔ نام میں کیا رکھا ہے ر سلیم آغا قزلباش ۔۔۔ لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۵ء، قیمت۔/100 روپے
۷۔ دکن کے رتن اور اربابِ فن (تنقیدی مضامین) ر رؤف خیر ۔۔۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء، قیمت۔/100 روپے
۸۔ متاعِ خیر (سوانح) ر صبیحہ سلطانہ ۔۔۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء، قیمت۔/100 روپے
۹۔ نشانِ منزل ر سید زبیر مشہدی ۔۔۔ مانسہرہ: شعر و سخن پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، قیمت۔/180 روپے
۱۰۔ آغوشِ وفا ر سید زبیر مشہدی ۔۔۔ مانسہرہ: شعر و سخن پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، قیمت۔/150 روپے
۱۱۔ اردو فارسی ضرب الامثال ر ڈاکٹر زیب النساء علی خان ۔۔۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۴ء، قیمت۔/140 روپے
۱۲۔ پاکستان: سائنسی تحقیق و ترقی ر ڈاکٹر مظہر قریشی ۔۔۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۴ء، قیمت۔/140 روپے
۱۳۔ منتخب عالمی افسانے ر قیصر سلیم ۔۔۔ کراچی: میڈیا گرافکس ۲۰۰۵ء، قیمت۔/400 روپے
۱۴۔ کالی مٹی اڑتے رنگ ر قیصر سلیم ۔۔۔ کراچی: میڈیا گرافکس ۲۰۰۴ء، قیمت۔/200 روپے
۱۵۔ رات گزر گئی جاناں (افسانے) ر قیصر سلیم ۔۔۔ کراچی: رائٹرز بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۲ء، قیمت۔/200 روپے
۱۶۔ رحمۃ اللعالمین: ایک نظر میں ر ڈاکٹر فرخ ملک ۔۔۔ لاہور: ڈاکٹر فرخ ملک ٹرسٹ، ۲۰۰۴ء
۱۷۔ آفتابِ ولایت ر صاحبزادہ سید محمد زین العابدین راشدی ۔۔۔ کراچی: السادات اکیڈمی شادمان ٹاؤن، ۲۰۰۴ء، قیمت۔/150 روپے
۱۸۔ ایشیا کا مقدمہ ر مہاتیر محمد ۔۔۔ لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، قیمت۔/150 روپے
۱۹۔ تال آہنگ ر پرویز پارس ۔۔۔ لاہور: پارس آرٹ سوسائٹی، ۲۰۰۳ء، قیمت۔/160 روپے

۲۰۔ عمر لاحاصل کا حاصل/ حیدر قریشی۔۔۔۔ نئی دہلی: اسیلا پرنٹنگ پریس ۲۰۰۵ء، قیمت-/200 روپے
۲۱۔ سخن ملتوی/ رؤف منیر۔۔۔۔ حیدرآباد (بھارت): خیری پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، قیمت-/100 روپے
۲۲۔ سفر لاسفر/ علیم صبا نویدی۔۔۔۔ چنئی (بھارت): ٹامل ناڈو پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، قیمت-/150 روپے
۲۳۔ اسم تاب/ علیم صبا نویدی۔۔۔۔ چنئی (بھارت): ٹامل ناڈو اردو پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، قیمت ۔/۳۰۰ روپے
۲۴۔ افق زاد/ علیم صبا نویدی۔۔۔۔ چنئی (بھارت): ٹامل ناڈو اردو پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، قیمت ۔/۲۵۰ روپے
۲۵۔ اونچے مکانوں کے قریب (غزلیات)/ ر۔س۔ اعجاز۔۔۔۔ کلکتہ: انشاء پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، قیمت-/160 روپے
۲۶۔ غالب/ ڈاکٹر سید عبداللطیف (اردو ترجمہ)
۲۷۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی/ ڈاکٹر نذیر احمد۔۔۔۔ دہلی، غالب اکیڈمی
۲۸۔ فریدالدین مسعود گنج شکر کے سال وصال کی تحقیق/ فیروزالدین احمد فریدی
۲۹۔ مشارق (مجموعہ حمد و نعت)/ اسعد ملتانی۔۔۔۔ لاہور: دارالکتاب، ۲۰۰۵ء، قیمت-/100 روپے
۳۰۔ اردو ہندی تاریخ/ جاوید اختر بھٹی۔۔۔۔ لاہور: دارالکتاب، ۲۰۰۴، قیمت ۔/۱۲۰ روپے
۳۱۔ اوراق کے اداریے/ پروفیسر اقبال آفاقی۔۔۔۔ لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۰، قیمت ۔/۱۵۰ روپے
۳۲۔ بیاض شب و روز/ ارمان نجمی۔۔۔۔ لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۱، قیمت ۔/۱۵۰ روپے
۳۳۔ لاتخف/ حقانی القاسمی
۳۴۔ پانچ منٹ کی زندگی/ خالد فتح محمد۔۔۔۔ گوجرانوالہ: ادراک پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، قیمت ۔/۱۲۰ روپے
۳۵۔ رسالہ انشا گوپی چند نارنگ نمبر
۳۶۔ آپ بیتی کے توانا لہجے/ قدرت اللہ شہزاد
۳۷۔ تحریک پاکستان اور کھتری برادری/ عصمت علی پٹیل
۳۸۔ غالب کی بعض تصانیف/ کالی داس گپتا۔۔۔۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۲ء، قیمت ۔/۱۲۰ روپے
۳۹۔ اطراف رشید احمد صدیقی/ اسلوب احمد انصاری۔۔۔۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۸ء،
قیمت-/100 روپے
۴۰۔ تاریخ انجمن بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد/ شہزاد منظر۔۔۔۔ کراچی: انجمن ترقی اردو
۴۱۔ حرفے چند (جلد اول، دوم، سوم)/ جمیل الدین عالی
۴۲۔ قائداعظم کے اسلامی افکار/ محمد شریف بقا۔۔۔۔ لاہور: نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵ء، قیمت-/125 روپے
۴۳۔ Youth & Pakistan Movement/ Dr. Sarfraz Hussain Mirza.----
Lahore: Nazaria Pakistan Foundation, 2004, Price, Rs.300/-
۴۴۔ Islamic Political Thought/ Allama Muhammad Iqbal.---- Islamabad
Ihamra, 2002, Price .295/-
۴۵۔ اقبالیاتی خاکے/ ڈاکٹر محمد وسیم انجم۔۔۔۔ راولپنڈی: انجم پبلشرز، ۲۰۰۵ء، قیمت ۔/۲۰۰ روپے

۴۶۔ پاکستان کا لسانی جغرافیہ/ ڈاکٹر غلام حیدر سندھی۔۔۔۔ اسلام آباد: نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان اسٹڈیز، ۲۰۰۵ء،
قیمت ۔/۳۰۰ روپے
۴۷۔ تنقید اور اسلوبیاتی تنقید/ پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ۔۔۔۔ علی گڑھ: شعبہ لسانیات، ۲۰۰۵ء، قیمت ۔/۱۲۵ روپے
۴۸۔ جھروکے (جلد اول تا چہارم)/ ڈاکٹر فاروق ملک۔۔۔۔ لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۳ء، قیمت ۔/۲۰۰ روپے
۴۹۔ آرزوئے سحر/ ظفر اعوان۔۔۔۔ لاہور: لاہور لٹریری فورم، ۲۰۰۴، قیمت ۔/۱۰۰ روپے

آج ایک عرصے بعد مخزن کا شمارہ ۹ موصول ہوا۔ بے حد خوشی ہوئی اور شکر گزار ہوں۔ رفتہ رفتہ مخزن نے معیار اور وقار پیدا کرلیا ہے جو انتہائی خوش آئند ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل، کراچی

مخزن ملتا رہتا ہے لیکن پابندی سے نہیں۔ یہ بھی ڈاک کا فتور ہوگا۔ شمارہ ۹ ملا۔ میں سمجھ رہا تھا گوشہ مشفق خواجہ ضخیم ہوگا لیکن محدود وقت میں اچھے مضامین لکھوانا بڑا مشکل کام ہے۔ ویسے آپ نے جو کچھ شائع کیا، بہت اہم اور قابل مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر مختار احمد اور ڈاکٹر سلیم اختر کے مضامین پسند آئے۔ رفیع الدین ہاشمی کے نام خطوط میں نے بہت دلچسپی سے پڑھے۔ حواشی بھی مفید ہیں۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد، علی گڑھ، انڈیا

مخزن ۹ کا مطالعہ مکمل کیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اسے پڑھے بغیر سکون نہ آئے۔ ایسی پیشکش کوئی معمولی بات نہیں، غیر معمولی بات ہے۔ مشفق خواجہ صاحب کے حوالے سے مضامین اور دیگر مواد کے معیاری ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اختلاف مجھے ہمیشہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی شخصیت کو بشری سانچے سے نکال کر نوری سانچے میں ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یا پھر ڈال دیا جاتا ہے۔ بشری کمزوریوں سے کوئی بھی مبرا نہیں چاہے وہ مشفق خواجہ ہوں یا ان سے پہلے وفات پانے والے دیگر بڑے ادیب۔ محمد عبدالرحمٰن چغتائی کا مضمون ''مرقع چغتائی۔ غالب کے مصور نسخے کی داستان تخلیق'' مضمون کے باکمال ہونے میں کوئی شک نہیں لیکن مخزن تو غیر مطبوعہ تحریروں کا پرچہ ہے۔ اگر مطبوعہ تحریروں کو جگہ دینے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تو ایسی تحریروں کا ڈھیر لگ جائے گا۔ ناگزیر صورت حال کا جواز بنانے کے لیے ایسی مطبوعہ تحریروں کے لیے ایک مستقل گوشہ ''نوادر'' کے نام سے بنا دیا جائے تو اچھا رہے گا۔ تحسین زہرا کا تحریر کردہ ''تنقید کا ساختیاتی رخ'' بھی بڑا پر مغز مقالہ ہے جس کے لیے تحسین زہرا مبارک باد کی مستحق ہیں۔ دیگر مضامین کے معیاری ہونے میں بھی کلام نہیں۔

عرفان احمد خان، لاہور

''غم زمانہ بھی سہل گزرا'' کے سلسلے میں آپ کے تاثرات کے نشے میں ہوں۔ یہ دو آتشہ تب بن گیا جب قصور کے ایک صاحب قلم یونس حسن لیکچرار نے اپنے منسلکہ مضمون میں تائید کر دی۔ میں یہ مضمون آپ کے موقر جریدہ 'مخزن' کے لیے بھیج رہا ہوں۔ اس سلسلے میں باقی فیصلہ آپ کا۔

ادیب سہیل، کراچی

لائبریری میں آنے والی نئی کتب

فہیم عثمانی

۱۔ حیات محبوب / محمد انوار امین، لاہور: پیسہ اخبار مرکز، ۲۰۰۰ء، ص ۴۷۱، قیمت۔ 450/

۲۔ میکدہ سلوک مصطفائی / عبدالستار مصطفائی قریشی، لاہور: اخوان مصطفائیہ، ۲۰۰۴ء، ص ۵۶۴، قیمت۔ 240/

۳۔ قوانین الحدود و تعزیرات / میاں مسعود احمد بھٹہ، لاہور: آ ہن ادارہ اشاعت و تحقیق، ۲۰۰۵ء، ص ۶۵۲، قیمت۔ 800/

۴۔ اردو ہے جس کا نام / سید روح الامین، گجرات: عزت اکادمی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۲، قیمت۔ 200/

۵۔ حسرت موہانی اور انقلاب آزادی / نفیس احمد صدیقی، اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۴ء، ص ۴۴۸، قیمت۔ 595/

۶۔ جگنی (شاعری) / افضالہ نورین، لاہور: سچیت کتاب گھر، ۲۰۰۴ء، ص ۹۶، قیمت۔ 43/

۷۔ مسلم ہندوستان کا ریاستی نظام / جمال محمد صدیقی (مترجم) لاہور: سچیت کتاب گھر، ۲۰۰۴ء، ص ۴۲۲، قیمت۔ 170/

۸۔ خواب سرائے / محمد صادق، لاہور: سنٹر آف چوکلی سائنسز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۳۱، قیمت۔ 128/

۹۔ اسلامی سیاسی افکار / ڈاکٹر محمد سرور، لاہور: علمی کتب خانہ، ۲۰۰۴ء، ص ۴۹۹، قیمت۔ 100/

۱۰۔ مسعود کھدر پوش (سوانح حیات) / عبداللہ ملک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۳۷۶، قیمت۔ 450/

۱۱۔ دیوان اختر / اختر سعید، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، مجلد قیمت۔ 400/

۱۲۔ خدا اور کائنات / پیام شاہ جہان پوری، لاہور: ادارہ تاریخ و تحقیق، ۲۰۰۴ء، ص ۲۸۴، قیمت۔ 200/

۱۳۔ شمشال بے مثال / مستنصر حسین تارڑ، لاہور: سنگ میل، ۲۰۰۴ء، ص ۲۳۸، قیمت۔ 200/

۱۴۔ تشید تاریخ / خواجہ منظر حسن منظر، کراچی: احمد برادرز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۰۹، قیمت۔ 160/

۱۵۔ تیرے بغیر / عروج شیخ، لاہور: عروج شیخ، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۲، قیمت۔ 125/

۱۶۔ اسلام بذریعہ قرآن / ارشد محمود، لاہور: گلشن پبلشرز، ۲۰۰۴ء، ص ۸۴۸، قیمت۔ 250/

۱۷۔ جائزہ زبان اردو (پنجاب) / خواجہ عبدالوحید (مرحوم) اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۸، قیمت۔ 150/

۱۸۔ شرق شناسی / ایڈورڈ ڈبلیو سعید، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۳۹۷، قیمت۔ 300/

۱۹۔ پاکستان میں اعلیٰ تعلیم (ماضی، حال اور مستقبل) / ڈاکٹر کیپٹن عثمان علی عیسانی / اسلام آباد: مقتدرہ، ۲۰۰۵ء، ص ۵۶۷، قیمت -/300

۲۰۔ مطالعہ علیم صبا نویدی / کاظم نائطی / ملی ناڈو اردو پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۴۸۰، قیمت۔ 500/

۲۱۔ پیر کامل ﷺ / عمیرہ احمد، لاہور: فیروز سنز، ۲۰۰۵ء، ص ۵۲۶، قیمت۔ 495/

۲۲۔ مقدمہ بہاول پور / شیخ المکرم حضرت مولانا محمد اکرم اعوان، چکوال: دار العرفان منارہ ۲۰۰۴ء، ص ۲۴۲

۲۳۔ کہانی ریت کی سلوٹ (افسانے) / احمد اعجاز بھٹہ، لاہور: مثال پبلشنگ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۲۷، قیمت-/120

۲۴۔ کہکشاں (افسانے) / خالدہ انور، لاہور: دعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۴، قیمت-/250

۲۵۔ ہر موڑ پر مسافر نواز / افتخار الدین خواجہ، اسلام آباد: دی نرسن انٹرنیشنل، ۲۰۰۴ء، ص ۳۴۰، قیمت-/200

۲۶۔ فکر آزادی در ادبیات مشروطیت ایران / دکتر مہر نور محمد خان، اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران، ۲۰۰۴ء، ص ۳۳۸، قیمت-/400

۲۷۔ گنجینہ خطی و حضری تا پوران / دکتر قاسم صافی، اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران، ۲۰۰۵ء، ص ۹۲، قیمت-/200

۲۸۔ نام میں کیا رکھا ہے (انشائیے) / سلیم آغا قزلباش، لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۵ء، ص ۸۳، قیمت-/100

۲۹۔ الست / میر سیفی، لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۸، قیمت-/150

۳۰۔ جمہوریت آمریت / طارق امین خالد، لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۴ء، ص ۲۶۴، قیمت-/150

۳۱۔ خوشبوئے نگارش (غزلیات) / فرزند علی شوق، گوجرانوالہ: فرزند علی شوق، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۴، قیمت-/200

۳۲۔ سحاب مدحت (مناقب) / سید مظفر نقوی، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۰، قیمت-/200

۳۳۔ آرزوئے سحر / ظفر اعوان، لاہور: طیب اقبال پرنٹرز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۰، قیمت-/100

۳۴۔ موسم ابر آلود تھا (غزلیات) / افتخار احمد طاہر، لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۲، قیمت-/150

۳۵۔ ایک سو ایک اولیاء اللہ خواتین / خواجہ شمس الدین عظیمی، کراچی: الکتاب پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۳۳۶

۳۶۔ اقبال جدید تنقیدی مناظرات / اسلوب احمد انصاری، علی گڑھ: یونیورسل بک ہاؤس، ۲۰۰۵ء، ص ۶۱۲، قیمت-/400

۳۷۔ قائداعظم کے اسلامی افکار / محمد شریف بقا، لاہور: نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۶، قیمت-/125

۳۸۔ آئینہ خانے / اختر پیامی، کراچی: زین پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۲۷۲، قیمت-/200

۳۹۔ فلسفہ توحید اور وحدت الوجود کا تحقیقی مطالعہ / ظفر اقبال خان، جھنگ: ادارہ اسلامیہ، ۲۰۰۵ء، ص ۳۶۸، قیمت-/250

۴۰۔ قاضی جی: کچھ یادیں۔ کچھ باتیں / عبدالحق مراد، باغ آزاد کشمیر: مکتبہ خلفائے راشدین، ۲۰۰۴ء، ص ۲۳۰، قیمت-/200

۴۱۔ دلی / عرفان احمد خاں (مترجم) لاہور: ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، ۲۰۰۵ء، ص ۴۴۶، قیمت-/225

۴۲۔ اردو ہندی (ایک تاریخی جائزہ) / جاوید اختر بھٹی، لاہور: دارالکتاب، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۴، قیمت-/120

۴۳۔ العطش (چالیس جدید مختصر مرثیوں کا مجموعہ) / سید وحید الحسن ہاشمی، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۶۴۸، قیمت-/950

۴۴۔ پاکستان: سائنسی تحقیق و ترقی / ڈاکٹر مظہر محمود قریشی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۴ء، ص ۱۵۵، قیمت-/140

۴۵۔ ریاض المسلمین / سید صادق علی قادری، کراچی: گلوبل اسلامک مشن، ۲۰۰۴ء، ص ۸۲۶

۴۶۔ حضرت محمد ﷺ حیات و خدمات / موسیٰ خان جلال زئی، لاہور: بک بز، ۲۰۰۳ء، ص ۴۹۶، قیمت-/450

۴۷۔ عراق عروج بغداد سے سقوط بغداد تک / موسیٰ خان جلال زئی، لاہور: دعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۲۴۰، قیمت-/185

۴۸۔ حقیقت انسان / حکیم محمد ارشد قادری، فیصل آباد: حکیم محمد ارشد قادری، ۲۰۰۴ء، ص ۲۸۲، قیمت-/250

۴۹۔ مادر ملت۔ سرمایہ ملت / شریف فاروق، اسلام آباد: ادارہ فلم و مطبوعات، ۲۰۰۳ء، ص ۳۹۷، قیمت-/250

۵۰۔ پولیس، جرائم اور تفتیش / چودھری شفقات احمد، لاہور: کوا پریٹو بک کمپنی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۲، قیمت-/300

۵۱۔ نور علی نور / عظمت ناز، لاہور: واصف علی واصف، ۲۰۰۵ء، ۳۴۲ ص، قیمت-/300

۵۲۔ کپورتھلہ سے لاہور تک / سید ناصر الدین، اسلام آباد: منزل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ۱۸۰ ص، قیمت-/200

۵۳۔ بیاد طارق / سید عارف محمود رضوی، گجرات: ٹیپو سلطان پبلی کیشنز، ص ۶۴

۵۴۔ جہد مسلسل (جلد دوم) / امان اللہ خان، راولپنڈی: ٹی۔ ایس پرنٹرز، ۲۰۰۵ء، ص ۳۵۲

۵۵۔ قریہ جاں / سید ضمیر جعفری، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۴۱۳، قیمت-/340 روپے

۵۶۔ جدید اسلامی ریاست میں قانون سازی اور مسائل / مولانا امین احسن اصلاحی، لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۵ء، ص ۴۷۰، قیمت-/350

۵۷۔ اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ / پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر، لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۳ء، ص ۳۸۷، قیمت-/300 روپے

۵۸۔ خطبات اقبال ایک مطالعہ / الطاف احمد اعظمی، لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۵ء، ص ۲۷۱، قیمت-/180 روپے

۵۹۔ مسلم ریاست جدید کیسے بنے / محمود مرزا، لاہور: دارالتذکیر، ص ۱۶۶، قیمت-/140 روپے

۶۰۔ فکریات / ڈاکٹر تحسین فراقی / کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء، ص ۲۷۹، قیمت-/250 روپے

۶۱۔ افادات (شعری مطالعات) / ڈاکٹر تحسین فراقی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۲۸۵، قیمت-/300 روپے

۶۲۔ سیرت رسول ﷺ / مولانا وحید الدین خاں، لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۶، قیمت-/100 روپے

English Books

1. Tribal Development and Planning. Vol. 1,2 / Arvind Kumar, New Delhi:Anmol Publications, 2004, 208, 409 p.
2. Understanding Intelligence in the 21st Century / L.V. Scott, London: Routledge,2004, 231p.
3. War of Words / Sandra Silberstein, London: Routledge, 2002, 197p.
4. Wars on Terrorism and Iraq / Thomas G. Weiss, London: Routledge, 2004, 247p.
5. Women and Development. Vol.1,2 / Ashok Kumar, New Delhi: Anmol Publications, 2005, 380p. 715 p.
6. Women's Role Under Islam / Shujaat Hussain, New Delhi: Anmol Publ. 2004, 295p
7. Women, Literacy and Development / Anna Robinson. London: Routledge 2004, 259p.
8. Work and Leisure / John. T. Haworth. London: Routledge, 2004, 238p.

9. Ear, Nose and Throat Histopathology / Laslie Michaels. London: Springer, 2003, 551p.
10. Biomechanics of the Musculo Skeleted System 2nd ed. / Benno M. Nigg. New York: John Wiley and Sons, 2003, 643p.
11. Drug Eruption Refernece Manual with CD-Rom 9th ed. / Jerome Z. Litt. London: The Parthenon Pub. 2003, 542p.
12. Female Pelvic Reconstructive Surgery / Stuart L. Stanton. London: Springer 2004, 383p.
13. Common Breast Lesions: a Photographic guide to diagnosis / Samuel Pilink. Cambridge: Cambridge. Uni. Press, 2003, 255p.
14. Handbook on nondestructive testing of concreted. 2nd ed. N.J. Carino, London:CRC Press, 2004, Various Pagings.
15. MDI and IDI: Safety, Health and the Environment. D.C. Allport. England: John Wiley and Sons, 2003, 438p.
16. Embryo and Fetal Pathology: textbook of facial rejuvenation. Enid Gilbert-Baruess. Cambridge: Uni. Press, 2004, 711p.
17. East Paksitan the End Game. Abdul Rahman Siddiqi. Oxford: Oxford Uni. Press, 2004, 260p.
18. A Pathan Odyssey. M. Aslam Khan Oxford: Oxford Uni. Press, 2004, 271p.
19. Between Past and Future: Selected Essays on South Asia. Eqbal Ahmed, Oxford Oxford University Press, 2004, 329p.
20. Local Government Finance: Ayaz Muhammad. Oxford: oxford University, 2004, 240 p.
21. Maps for Lost loves: Nadeem Aslam. London: Faber and faber, 2004, 369p.
22. Four Walls and a Black Veil: Fahmida Riaz. Oxford: Oxford Uni. Press, 2004, 138p.
23. Dear Mr. Jinnah / Roger D. Lond. Oxford: Oxford Uni. Press, 2004, 328p.
24. Pilgrims of Love / Pnina Werbner. Oxford. Uni. Press, 2003, 348p.
25. From Exxon to Engro: a travel companion to the Northern Areas of Pakistan : Shaukat Raza Mirza. Oxford: Oxford University Press, 2005. 224p.
26. Cricket: a bridge of peace / Tahir Jahangir: Oxford: Oxford University Press, 2004, 140p
27. The Ulema in Contemporary Islam / M. Qasim Zaman. Oxford: Oxford University Press 2004, 293p.
28. The Politics of Islamic Finance / Clement M. Henry. Oxford: Oxford University Press, 2004, 307p.
29. The Media and War on Terrorism / Stephen Hess. Oxford: Oxford University Press, 2003, 307p
30. A Gentleman gets Dressed Up / John Bridges. New Delhi" Viva Books, 2004 177p.
31. Charlie Wilson's War / George Gile. Lahore: Vanguard Books, 2003, 550p
32. Contemporary Arab Thought: Studies in post 1967 Arab intellectual history: Ibrahim M. Abu Rabi. London: Pluto Press, 2004, 485p
33. Cradle of Islam: the hijab and the quest for an Arabian identity / Maj. Yamani,London; I.B. Tauris Pub. 2004, 226p.
34. Genocide, War Crimes and the West: history and complicity / Adam Jones.London: Zed Books, 2004, 424p.
35. Global Corruption Report 2004 / Adam Jones. London: Pluto Press, 2004, 353p.
36. Globalization: Tame it or Scrap it? / Greg Buckman. London: Zed Books, 2004, 229p.
37. Good Muslim, Bad Muslim/ Mahmood Hamdani. Lahore: Vanguard Books, 2005, 304p.
38. Imperial Over Stretch / Roger Burbach. London: Zed Books 2004, 240p.
39. The Idea of Pakistan / Stephen Philip Cohen. Lahore: Vanguard

Books, 2005, 380p.

40. Writing and Producing Radio Dramas / Esta De Fossard. New Delhi: Sage Publications, 2005, 325p
41. Asia Unplugged: the Wireless and Mobile Media Boom / Madan Mohan Rao.New Delhi: Response Boos, 2005, 464p.
42. Corporate Entrepreneurship: building an entrepreneurial organization . Leena Parmar. New York: Palgrave Macmillan. 2005, 362p.
43. Database Management Systems: designing & building business .- 3rd. ed./Gerald V. Post. New York: McGraw-Hill, 2005, 424p.
44. Financial and Management Accounting / Jan R. Williams. New York: McGraw Hill, 2005, 1168p.
45. Management Ethics / Norman E. Bowie. Australia: Black Well Publishers, 2005, 159p.
46. The Behavioral Foundations of Strategic Management at Work / Philip Brainley.Australia: Black Well Publications, 2005, 147p.
47. The three faces of Leadership. 2nd ed. / Mary Jo Hatch. Australia. Blackwell, 2005, 169p.
48. Governing Sustainable Cities / Bob Evans. London: Eath Scan, 2005, 146p.
49. DNA: Forensic and legal applications/ Lawrence Kobilinsky, New Jersey Wiley & Sons, 205, 364p.
50. Theory of Functions of a Complex Variable / Shanti Narayan. New Delhi: S. Chand and Company, 2005, 606p.

قائداعظم لائبریری کی علمی وادبی سرگرمیاں
جولائی تا دسمبر ۲۰۰۵ء

شہناز مزمل

۱۶ جولائی ۲۰۰۵ء

Lecture: "Knowledge Management for Information Professionals"

Speaker: Dr. Sajjad-ur-Rehman, Prof. Library and Information Science

Moderator: Saeeda Khan

پروفیسر ڈاکٹر سجاد الرحمٰن صاحب شعبہ لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس کے استاد آج کل بحیثیت پروفیسر لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس کویت یونیورسٹی کویت میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس کے حوالے سے آپ کا لیکچر بہت مفید اور کارآمد تھا۔ آپ نے کہا کہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ لمحہ بہ لمحہ رونما ہونے والی تبدیلی سے آگاہ رہا جائے۔ اور اپنے آپ کو اس کا حصہ بنایا جائے۔

۲۰ اگست ۲۰۰۵ء

Lecture: Information needs, Seeking and use of the Corporate Sector:

Findings of a Reseaan Project.

Speaker: Dr. Mumtaz Anwar, ex Chairman Library Science, Deptt. University of the Punjab. Presently Professor at Kuwait University, Kuwait

Moderator: Saeeda Khan

بحیثیت پروفیسر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ نے اپنے تجربات سے سامعین کو آگاہ کیا۔ آپ کا لیکچر لائبریری سائنس کے طلباء کے لیے نہایت اہمیت کا حامل تھا۔

۳۱/اگست ۲۰۰۵ء

مذاکرہ ''تصور پاکستان۔ پرانی نسل سے نئی نسل تک''

صدارت: جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال

شرکائے مذاکرہ: عنایت اللہ صاحب، ایکس ایمبیسڈ آف پاکستان

قاضی جاوید صاحب، ریجنل ڈائریکٹر اکادمی ادبیات پاکستان

میزبان: سعیدہ خان

اس مذاکرے میں موضوع کی مناسبت سے ایک جامع اور مدلل گفتگو ہوئی۔ قاضی صاحب نے کہا کہ ہم پاکستان کو علامہ اقبال کے خواب اور قائداعظم کی سوچ کے مطابق نہیں بنا سکے۔ عنایت اللہ صاحب نے کہا کہ پاکستان کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ آبادی میں اضافہ ہے۔ آج ہمیں اپنے وسائل سے بڑھ کر صحت، تعلیم اور دوسرے مسائل سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے فرمایا کہ پاکستان میں اس وقت انقلاب کی ضرورت ہے اور اس کے لیے جدید علم کو حاصل کرنا ہوگا۔ اور ترقی یافتہ اقوام میں شامل ہونے کے لیے علامہ اقبال اور قائداعظم کے روشن خیال نظریات کو اپنانا ہوگا۔

۳/اکتوبر ۲۰۰۵ء

مذاکرہ ''ٹی وی چینلز۔ نئی معاشرتی قدروں کے خالق''

شرکائے مذاکرہ

محترمہ منیزہ ہاشمی صاحبہ، جنرل منیجر، ہم ٹی وی، لاہور

محترم خاور نعیم ہاشمی بیورو چیف، جیو ٹی وی

محترم ملک نصر اللہ، بیورو چیف اے آر وائی

محترم اشرف عظیم صاحب جنرل منیجر پی ٹی وی لاہور

محترم امجد اسلام امجد، معروف شاعر، ادیب

میزبان: محترم شجاعت ہاشمی

امجد اسلام امجد نے قیام پاکستان سے لے کر اب تک کے میڈیا کے کردار کے حوالے سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ نئے چینلز کی وجہ سے مقابلے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ منیزہ ہاشمی صاحبہ نے کہا کہ حالات کے مطابق قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی اقدار کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ اے جی جوش صاحب نے کہا کہ ہم اسلامی اقدار اور پاکستانی شناخت کو بھول گئے ہیں۔ طلبا و طالبات کی کثیر تعداد نے بھی مذاکرے میں شرکت کی۔

۲۸/نومبر ۲۰۰۵ء

مذاکرہ ''پاکستان میں کتب کی اشاعت کے مسائل''

شرکائے مذاکرہ

محترم جاوید اختر صاحب، ڈائریکٹر جنرل پبلک لائبریریز پنجاب

محترم زبیر ملک صاحب، جنرل سیکرٹری ناشرین ایسوسی ایشن لاہور

محترم محمد تاج صاحب، چیف لائبریرین قائداعظم لائبریری

محترم خالد شریف صاحب، پروپرائٹر ماورا پبلی کیشنز لاہور

محترم آغا امیر حسین، پروپرائٹر کلاسک پبلی کیشنز لاہور

محترم ضیاء قریشی صاحب، پروپرائٹر پولیمر پرنٹنگ پریس، لاہور

محترم شجاعت ہاشمی (میزبان)

مذاکرے کے آغاز میں ڈائریکٹر جنرل جاوید اختر صاحب نے لائبریریوں کی اہمیت کے بارے میں بتایا۔ ضیاء قریشی صاحب نے کہا کہ چھوٹی چھوٹی یونیورسٹیوں نے اپنے علیحدہ علیحدہ نصاب ترتیب دے لیے ہیں جس کی وجہ سے نصابی کتب کم تعداد میں شائع ہو رہی ہیں۔ آغا امیر حسین نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں تحقیق کا کام نہیں ہو رہا۔ حکومت کی امداد سے چلنے والے ادارے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہے۔ جناب خالد شریف نے کہا کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں بہت سی بڑی عوامی تحریکیں اٹھیں۔ اس دور میں بہت کتابیں شائع ہوئیں اور بڑا ادب تخلیق ہوا۔ محمد تاج صاحب نے وضاحت کی کہ شرح خواندگی کم ہوگی تو اداروں کی تعداد بھی کم ہوگی اور پڑھنے والے بھی کم ہوں گے کتب کم شائع ہوں گی اور لائبریریوں کی تعداد بھی کم ہوگی۔ زبیر ملک صاحب نے کہا کاغذ، روشنائی اور مشینری بہت مہنگی ہے اور حکومت ہمیں کوئی رعایت نہیں دیتی۔ آخر میں بحث کو سمیٹتے ہوئے جاوید اختر صاحب نے کہا کہ تاثر غلط ہے کہ نئی نسل پڑھ نہیں رہی ہے۔ پبلشر کتاب کی قیمت کو کم کریں اور مارکیٹ تک پہنچائیں۔ کتاب سستی ہوگی تو مانگ زیادہ بڑھے گی۔ اس قسم کے علمی اور ادبی مذاکرے فروغ علم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ہماری لائبریری اس قسم کے پروگرام کرتی رہتی ہے۔

دسویں شمارے کے قلمی معاونین

ڈاکٹر زاہد منیر عامر، شعبہ اردو، اورینٹل کالج لاہور

ڈاکٹر انور سدید، ۱۷۲ ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناصر عباس نیر، استاد شعبہ اردو، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور

ڈاکٹر عبدالمغنی، پٹنہ، انڈیا۔ نیو عظیم آباد کالونی، صندل نگر پوسٹ آفس مہندرو پٹنہ 800006 بھارت

محمد حمزہ فاروقی، 291/10 خیابان شجاعت ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

پرتو روھیلہ (مختار علی خاں) مکان نمبر 8 اسٹریٹ F8/1-42، اسلام آباد

یونس حسن، لیکچرار اردو، مکان نمبر 16۔ایس 53 گلی صوفی ابراہیم والی، کوٹ اسلام پورہ، قصور

ڈاکٹر سید اختیار جعفری، ''سہارا'' A-26, 18/14 خلدری ٹولہ، تاج گنج روڈ آگرہ 282001 بھارت

شفقت رضوی 2085, Stillwater p1, Lewisville TX 7506,7 U.S.A

ڈاکٹر سلیم اختر، ۵۶۹، جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

سمیرا احمریں، ملتان

ناز شوکت علی، بلاک ایل/L-185، ماڈل ٹاؤن ایکسٹنشن لاہور

اسلم کمال، 565 جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

پروفیسر غلام رسول تنویر، ۳۶ مسلم پارک، توسیع مسلم ٹاؤن 1، سرگودھا روڈ فیصل آباد